نگار

قیمت ۸/

اصحاب کہف

(ڈراما)

اڈیٹر نگار کے قلم سے (۲۰۰ صفحات پر)

تمام وہ حضرات جن کا نام ۳۱ر جنوری ۳۶ء کو رجسٹر خریداران میں مندرج پایا جائے گا صرف بارہ آنے کے ٹکٹ موصول ہونے پر حاصل کر سکتے ہیں ——— منیجر

نگار

جلد ۲۸ | فہرست مضامین ستمبر ۳۵ء | شمارہ ۳

ملاحظات ——— ۲
پارسی اہل کتاب ہیں ——— محمد طاہر رضوی ام۔اے ——— ۹
جھانسی کی رانی ——— ۱۹
کسبی ——— سید ابوسعید بزمی ام۔اے ——— ۳۶
دولت کی مساوی تقسیم ——— ا ج ——— ۵۲
عورت کی منطق ——— ۵۷
نجوم کے بعض تاریخی و علمی مباحث ——— عبدالمالک آروی ——— ۶۰
باب المراسلۃ والمناظرہ ——— ۷۳
منظومات ——— حافظ، حزیں، فطرت، شمیم ——— ۷۷

نگار

اڈیٹر:- نیاز فتحپوری

جلد ۲۸	ستمبر ۳۵ء	شمارہ ۳

ملاحظات

ادارۂ قومی میں زبان کی اہمیت

اور

اُردو زبان کے مستقبل پر ایک نظر

انسان خواہ وہ کسی مرز و بوم سے متعلق ہو، بلحاظ اپنی نوع کے ایک ہی چیز ہے، اور "مستقیم القامة، متحرک بالارادہ حیوان ناطق" ہونے کی منطقی تعریف، شرق سے غرب تک اور شمال سے جنوب تک ہر ملک و قوم کے انسان پر صادق آتی ہے۔ لیکن باینہمہ اتحاد نوعی و توافق جنسی، ہر ملک کا انسان دوسرے ملک کے انسان سے بالکل علحدہ نظر آتا ہے، اور یہ ممکن نہیں کہ ایک قوم کا آدمی دوسری قوم میں شامل ہو کر لطف و راحت سے زندگی بسر کر سکے۔ اس کا سبب صرف یہ ہے کہ انسانیت فی الحقیقت نام اُس کی مخصوص شکل و صورت کا نہیں، بلکہ ایک خاص تہذیب معاشرت ایک مخصوص میلان طبع اور ایک متعین ذوق کا ہے جو جغرافی ماحول اور طبیعی حوادث کے ماتحت پیدا ہو کر نسلاً بعد نسلٍ منتقل ہوتا چلا آتا ہے اور اس اختلاف ذوق کا نام اختلافِ تہذیب، اختلاف طبائع، اختلاف معاشرت، اور اختلافِ

زبان ہے۔ آپ قطب شمالی سے کے منطقۂ بارد اور خطِ استوا کے نیچے واقع ہونے والے ممالک کا مطالعہ کیجئے تو آپ کو دونوں جگہ کے انسانوں میں بہت زیادہ نمایاں فرق محسوس ہوگا کیونکہ یہاں کے جغرافی حالات ایک دوسرے سے بہت زیادہ مختلف ہیں اور یہ اختلاف نہ صرف تہذیب و معاشرت بلکہ ظاہری شکل و صورت میں بھی کافی تغیر پیدا کردیتا ہے۔ الغرض جغرافی ماحول اور حوادث تاریخی کا اختلاف اتنا زبردست محرک اختلاف طبائع کا ہے کہ اس کا مقابلہ ممکن نہیں اور اسی لئے کہا جاتا ہے کہ قومی خصوصیات بالکل فطری مجبوریاں ہیں اور ان کو دور کرنا نہ صرف فطرت کا مقابلہ کرنا ہے، بلکہ قومی شیرازہ کو درہم برہم کردینا ہے۔

ان اختلافات میں سب سے زیادہ نمایاں چیز جو بیک وقت ایک قوم کو دوسری قوم سے متمائز کرنے والی بھی ہے اور افراد قوم کی شیرازہ بندی بھی، زبان کا اختلاف ہے کہ اس کو سنتے ہی ہم جان لیتے ہیں کہ فلاں شخص کس ملک و قوم سے تعلق رکھتا ہے اور اگر وہ اپنا ہم زبان ہے تو فوراً جذبۂ ہمدردی داخوت میں تحریک پیدا ہوجاتی ہے۔ اس لئے اصلاح زبان و تحفظ زبان کا مسئلہ ہمیشہ تمام قوموں میں نہایت اہتم بالشان مسئلہ رہا ہے اور جب کسی قوم کا دور ارتقاء شروع ہوا ہے تو لازماً اس نے اس پر بھی خاص توجہ کی ہے۔

ہم کو اسوقت ساری دنیا سے بحث نہیں صرف ہندوستان کی مختلف زبانوں کے مقابلہ میں اپنی زبان اور اس کے مستقبل پر سرسری نگاہ ڈالنا مقصود ہے۔ اب سے چند سال قبل ہندوستان کی جمہوری زبان اردو سمجھی جاتی تھی، اسی میں خط وکتابت ہوتی تھی، دفاتر سرکاری میں اسی کا رواج تھا اور ہندو ریاستوں کے کاغذات بھی اسی زبان اور اسی خط میں مرتب ہوتے تھے۔ لیکن جب یہاں کی سیاسیات نے ہندوؤں کے اندر ایک خاص ذہنی انقلاب پیدا کرکے وطنیت کا جذبہ اُن میں اُبھارا، تو زبان اور رسم الخط کی طرف بھی ان کو توجہ ہوئی اور چونکہ اردو زبان اور اس کا انداز تحریر دونوں بالکل غیر آرین چیزیں تھیں اس لئے وہ ہندی زبان اور ہندی رسم خط کی طرف مایل ہوگئے جو علاوہ خالص قومی و وطنی رنگ رکھنے کے (سنسکرت سے مماثل ہونے کے باعث) انکے لئے مذہبی تقدس کی بھی چیز ہے۔

پھر اس وقت ہم کو اس بحث میں اُلجھنا نہیں ہے کہ اردو اور ہندی میں کون قابل ترجیح ہے، یہ یا دہ ہندوؤں کا یہ میلان قابل ستایش ہے یا لائق استکراہ بلکہ صرف واقعات کو سامنے رکھ کر یہ دیکھنا ہے کہ اردو کی حفاظت مسلمانوں کے لئے ضروری ہے یا نہیں اور اگر ہے تو اس کی کیا تدابیر ہوسکتی ہیں۔

اس دوران میں اکثر اہل فکر نے اس مسئلہ پر اظہار خیال کیا اور وہ لوگ جو ہندوستان میں متحدہ قومیت دیکھنا چاہتے ہیں انھوں نے باہمی مفاہمت کی چند صورتیں بھی پیش کیں مثلاً یہ کہ بجائے اردو ہندی کے اس متحدہ زبان کا نام ہندوستانی رکھا جائے، اردو سے عربی فارسی کے الفاظ نکالکر (جن سے ہندوؤں کو بوئے خون آتی ہے)

اُن کے لئے زیادہ قابل قبول بنایا جائے اور ہندو مسلمان دونوں کو اُردو و ہندی رسم الخط سیکھنے پر مجبور کیا جائے وغیرہ وغیرہ۔ لیکن میں نے ان شوروں کو کبھی اہمیت نہیں دی کیونکہ ہندو مسلمانوں کے درمیان اختلاف مذہب اور اختلاف معاشرت و تہذیب کی اتنی زبردست خلیج حایل ہے کہ اُس کو پُر کرنے کا کوئی امکان ہی نہیں ہے اور چونکہ ہندو قوم ارتقائی حالت میں ہے اس لئے وہ اپنے بڑھے ہوئے حوصلہ کے مقابلہ میں نہ کسی رواداری سے کام لینے پر آمادہ ہو سکتی ہے اور نہ وہ مسلمانوں کے کسی ایثار کی قدر کر سکتی ہے۔

اگر آج مسلمان عربی و فارسی کے تمام الفاظ نکال کر اُردو میں وید اور گیتا کے الفاظ استعمال کرنے لگیں تو بھی ہندو اپنی ہندی تحریروں میں سنسکرت کے ثقیل الفاظ کا استعمال ترک نہ کریں گے، اُن کو نفرت صرف اُردو زبان سے نہیں ہے بلکہ اُردو رسم الخط سے بھی ہے اور وہ کسی ایسی یادگار کو قائم رکھنا نہیں چاہتے جو مسلمانوں کے دورِ حکومت سے کوئی ہلکا سا بھی تعلق رکھتی ہو۔

اس لئے میرے نزدیک مسلمانوں کی یہ کوشش کہ وہ متحدہ زبان کے اُصول کو تسلیم کر کے رسم خط بدستور اُردو کا قایم رکھیں کبھی ہندوؤں کے لئے قابل قبول نہیں ہو سکتی، خواہ وہ اُردو کا نام بدلکر بجائے ہندوستانی کے ہندی یا برج بھاشا ہی کیوں نہ رکھدیں۔

گزشتہ دس پندرہ سال میں ہندی زبان اور ہندی رسم خط کے متعلق ہندوؤں نے کیا تدابیر اختیار کیں اور کس قدر کامیابی حاصل کی، کسی سے مخفی نہیں۔ ملک کا کوئی گوشہ ایسا نہیں جہاں "ہندی پرچار" کی سبھائیں موجود نہ ہوں اور ہندو قوم نے ہندی زبان اور ہندی رسم خط کے مسئلہ کو سیاسی و مرکزی اہمیت دیکر پورے ملک و قوم کی توجہ مبذول نہ کرلی ہو۔ اُن کے تمام اکابر خواہ وہ سیاست سے تعلق رکھتے ہوں یا اصلاح مذہب و معاشرت سے، طبقۂ امراء سے وابستہ ہوں یا طبقۂ عمال سے، سب اجتماعی حیثیت سے اس طرف متوجہ ہیں اور اسی کا نتیجہ ہے کہ آج ہندی رسایل و اخبارات اور ہندی تصانیف اپنی اشاعت کے لحاظ سے اُردو کے مقابلہ میں بہت زیادہ ترقی یافتہ نظر آتی ہیں۔ ہندی زبان کی درسگاہیں قائم ہو رہی ہیں۔ والیان ریاست ہندی تصانیف پر بیش بہا انعامات دے رہے ہیں، ہندو ریاستوں کے دفاتر و قوانین سب ہندی بلکہ سنسکرت زبان میں منتقل ہو رہے ہیں، خود حکومت برطانیہ کے دفاتر و عدالتگاہوں میں ہندی اپنی جگہ پیدا کرتی جا رہی ہے، یہاں تک کہ اگر آپ ڈاکخانے جائیں تو وہاں بھی ہندی فارم آپ کے سامنے پیش کیا جاتا ہے اور اُردو فارم باوجود طلب کرنے کے نہیں دیا جاتا —— اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ہندی کی ترویج و اشاعت کے لئے ہندو کتنی منظم و باقاعدہ کوشش کر رہے ہیں اور اس لئے کوئی وجہ نہیں کہ ان کو کامیابی نہ ہو۔ برخلاف اس کے مسلمانوں کو دیکھئے کہ وہ اُردو کی ترقی و اشاعت کے لئے کیا کر رہے ہیں۔

مسلمانوں کی جماعت کا غالب حصہ وہ ہے جو ہمارے علماء مذہب کے زیر اثر ہے اور ان کو اُردو سے جو دلچسپی ہوسکتی ہے ظاہر ہے۔ کیونکہ ان کی تعلیم یکسر عربی زبان میں ہوتی ہے، اور وہ بھی ادب و انشاء کی نہیں بلکہ صرف فقہ و حدیث کی اس لئے وہ خود اُردو سے بالکل نابلد ہوتے ہیں اور ایک فقرہ صحیح نہیں لکھ سکتے۔

اب رہگیا دوسرا گروہ جو ہمارا سیاسی رہنما کہلاتا ہے، سو آپ مسلم کانفرنس، مسلم لیگ اور انجمن ہائے خلافت و تبلیغ وغیرہ کی تمام روئدادیں پڑھ ڈالئے، آپ کو کسی ایک جگہ بھی اُردو زبان کی حفاظت و ترقی کا ذکر نظر نہ آئے گا اور کبھی کسی ایک لیڈر کی زبان سے آپ نے یہ نہ سُنا ہوگا کہ مسلمانوں کی ہئیت اجتماعی میں اُردو زبان کو بھی کوئی اہمیت حاصل ہے ---- اور تو اور، خود ہماری مُسلم یونیورسٹی نے اس وقت تک کوئی ایسا لائحہ عمل پیش نہیں کیا جو اس باب میں ہماری رہنمائی کرسکے۔ الغرض اُردو زبان اسوقت حد درجہ نازک دور سے گزر رہی ہے، اور ہندو مسلم نزاع کے سلسلہ میں اس نے خاص سیاسی اہمیت حاصل کرلی ہے، اس لئے اگر اس سیاسی جنگ میں ہندوؤں کو کامیابی ہوئی جس کے کھُلے ہوئے اسباب ہر چہار طرف نظر آرہے ہیں تو اُردو زبان اور اُردو رسم الخط کے مستقبل کی تاریکی روشن ہے۔

میں اس وقت یہ بحث چھیڑنا مناسب نہیں سمجھتا کہ اُردو و ہندی میں قابل ترجیح کون ہے اور نہ اس رائے کا وقت و موقعہ کہ ہندوؤں کا یہ طرزِ عمل انصاف پر مبنی ہے یا نہیں، لیکن بہ حیثیت مسلمان ہونے کے (مسلمان بہ لحاظ مذہب نہیں بلکہ بہ لحاظ تہذیب و معاشرتِ قومی) میں یہ سوچنے پر ضرور مجبور ہوں کہ کیا اُردو زبان اور اُردو رسم الخط کا چھوڑنا ہمارے لئے ممکن و مناسب ہے اور اگر نہیں، تو پھر ہمکو اسکے تحفظ و بقا کے لئے کیا تدبیریں اختیار کرنا چاہئے۔

یہ میں پہلے ہی عرض کرچکا ہوں کہ عناصر قومی میں زبان کا عنصر نہایت قوی عنصر سمجھا جاتا ہے اور شیرازۂ قومی کو یکجا رکھنے میں زبان سے زیادہ اہم کوئی چیز نہیں۔ اس لئے اگر مسلمان بہ لحاظ قومیت ہندوؤں سے مختلف ہیں تو کوئی وجہ نہیں کہ وہ اپنی قومی خصوصیات کو ترک کرنے کی کوشش کریں جبکہ حقیقتاً کوئی قوم اپنی خصوصیات کو ترک کرہی نہیں سکتی۔

اس میں شک نہیں کہ یہ مسئلہ بجائے خود کافی بحث طلب ہے کہ ایک ہی ملک کی رہنے والی دو جماعتوں میں اختلافِ قومیت کیسا۔ لیکن قومیت کا ایک مفہوم تو وہ ہے جس میں وطنیت جزو مشترک ہوا کرتی ہے اور دوسرا وہ ہے جو تہذیب و معاشرت سے تعلق رکھتا ہے، اس لئے ہندو مسلمان وطنیت کے لحاظ سے تو یقیناً ایک ہی چیز ہیں اور جس وقت ملک و وطن کی خدمت کا سوال پیش آئے ان دونوں میں کوئی اختلاف نہ ہونا چاہئے، لیکن جس حد تک ذوق و میلان یا تہذیب و معاشرت کا تعلق ہے یہ دونوں بالکل ایک دوسرے

سے علحدہ ہیں اور ہمیشہ علحدہ رہیں گے۔

اس ذوق کے اختلاف کا سب سے بڑا سبب مذہب ہے سامی مذاہب اور خصوصیت کے ساتھ مذہب اسلام کی یہ انفرادیت کہ وہ جہاں کہیں پہونچا تمام ملکی و قومی رشتوں کو توڑ کر اس نے خاص اپنے رشتہ سے لوگوں کو وابستہ کر لیا اور ان کی اندرونی و بیرونی زندگی پر چھا کر ایک مخصوص تہذیب کا عادی بنا دیا اتنی زبردست چیز تھی کہ ہندوستان کے رہنے والے بھی اس سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے اور جس شخص نے یہاں اسلام قبول کیا، اس نے گویا اپنی قدیم ہندی تہذیب کو بھی خیرباد کہدیا۔

یقیناً ہندوستان کی مسلم آبادی کا بڑا حصہ وہی ہے جو کسی وقت ہندو تھا، لیکن آج وہ جن خصوصیات کا حامل ہے، وہ ہندو معاشرت، ہندو تہذیب اور ہندو ذہنیت سے اس قدر مختلف ہیں کہ کبھی یہ بات ذہن میں بھی نہیں آتی کہ یہ آبادی کسی وقت ہندو رہی ہوگی ــ مسلمانوں کی بود و باش، ان کی رفتار و گفتار، ان کی وضع قطع، ان کا ذوق ہندوؤں سے بالکل علحدہ ہے اور اقتصادی ذہنیت کا فرق تو خیر ظاہر ہی ہے کہ ایک کماتا ہے بچانے کے لئے اور دوسرا صرف اُڑانے کے لئے۔

اس وقت اس بحث کی ضرورت نہیں کہ ہندو مسلمانوں میں کس جماعت کا کلچر قابل تعریف ہے اور کس کا لائق مذمت بلکہ مدعا صرف یہ ظاہر کرنا ہے کہ دونوں میں زمین و آسمان کا فرق ہے اور ان میں اتحاد معاشرت و معیشت کی صورت پیدا ہونا تقریباً ناممکن ہے اور چونکہ زبان قومی خصوصیات میں سب سے زیادہ مہتم بالشان چیز ہے اس لئے مسلمانوں کے لئے بالکل ناممکن ہے کہ وہ ہندی زبان یا ہندی رسم الخط اختیار کریں اور ہندوؤں سے بھی یہ توقع رکھنا کہ وہ ہندی پرچار کو چھوڑ دیں بالکل خلاف عقل ہے۔

ان دونوں جماعتوں کی ذہنیتوں کے درمیان اتنا زبردست فرق ہے کہ کبھی ملکر کام کر ہی نہیں سکتیں اور ان کو علحدہ علحدہ اپنی خصوصیات قومی کا تحفظ ضروری ہے، پھر چونکہ مسلمانوں کی جماعت بہ لحاظ اعداد و شمار ہندوؤں سے کم ہے اس لئے ظاہر ہے کہ اس کشاکش میں ان کو خطرات کا زیادہ سامنا کرنا ہے اور اگر انھوں نے غیر معمولی جد و جہد سے کام نہ لیا تو ان کی شکست یقینی ہے۔

جو لوگ اخباروں کا مطالعہ کرتے رہتے ہیں ان سے مخفی نہیں کہ ہندو کس سرعت و استحکام کے ساتھ ہندی زبان اور ہندی رسم الخط کو ملک میں رائج کر رہے ہیں، اور برخلاف اس کے مسلمانوں کی بے پرواہی کا جو عالم ہے اس کا حال تصنیفی و صحافتی اداروں سے پوچھئے۔ انفرادی طور پر کہیں کہیں لوگوں نے انجمنیں قائم کرلی ہیں لیکن سوائے کبھی کبھی کوئی مقالہ پڑھ دینے کے وہ کوئی اور تعمیری پروگرام اپنے سامنے نہیں رکھتے۔ اسوقت سب سے زیادہ ضرورت اس امر کی ہے کہ محکمہ تعلیم کو اردو کی اہمیت کی طرف متوجہ کیا جائے اور اگر مسلمانوں

کی کوئی سیاسی جماعت اس وقت موجود ہے تو وہ اصولی طور پر ترویج واشاعت اردو کو اپنے مقاصد میں شامل کرے۔ علاوہ اس کے انفرادی طور پر ہر مسلمان کو بطور قومی فرض کے اپنی آمدنی کا کوئی ایسا حصہ جسے وہ بہ آسانی نکال سکتا ہے، خریداری کتب ورسایل کے لئے علٰحدہ کر دینا چاہئے، کیونکہ جب تک کسی قوم کی صحافت اچھی حالت میں نہ ہو، زبان کی صحیح خدمت انجام دینا مشکل ہے۔ اسی کے ساتھ ہر صوبہ میں ایک ایسا ادارہ ہونا چاہئے جو زبان کے متعلق محکمۂ تعلیم سے اپنے حقوق کا مطالبہ کرتا رہے اور نصاب کی کتابوں پر نقد وتبصرہ کرکے بتاتا رہے کہ ان میں کیا نقایص ہیں بلکہ اگر ممکن ہو تو وہ خود نصاب کے لئے کتابیں مرتب کرے اور اسی کے ساتھ ایسے آدمی پیش کرے جو صحیح معنے میں اُردو جانتے ہوں اور اُردو کی تعلیم دینے والے ہوں۔ اس کے لئے تمام مرکزی مقامات پر ٹریننگ کالج قائم کرکے فارسی وعربی کی طرح امتحانات مقرر کرنا چاہئے انعامات وغیرہ کے ذریعہ سے طلبہ میں شوق وولولہ پیدا کرنا چاہئے اور سفری کتب خانے قائم کرکے نہ صرف شہروں بلکہ قصبات ودیہات میں بھی کتابوں اور اخباروں کا ذوق پیدا کرنا چاہئے۔

ہمیں یہ معلوم کرکے مسرت ہوئی کہ لکھنؤ میں بعض پُرجوش بہی خواہان اُردو نے ایک ایسے ادارہ کی بنیاد ڈالی ہے جس کا نام "لکھنؤ اُردو اکاڈیمی" ہے۔ یہ چند شعبوں میں منقسم ہے۔ (۱) شعبۂ نقد ومطالعہ، (۲) شعبۂ درس وتعلیم (۳) شعبۂ تصنیف وتالیف

پہلے شعبہ سے مقصود اُردو کلاسکس کی طرف لوگوں کو متوجہ کرنا ہے تاکہ زبان کا صحیح ذوق لوگوں میں پیدا ہو اور وہ سمجھ سکیں کہ اُردو ملک کی دوسری زبانوں کے مقابلہ میں کتنی وسعت رکھتی ہے۔ اسی کے ساتھ اسکا یہ فرض بھی ہوگا کہ وہ صوبہ متحدہ کے اسکولوں اور یونیورسٹیوں کی درسی کتابوں کی جانچ کرکے اُن کے نقایص کی طرف محکمۂ تعلیم کو متوجہ کرے۔

دوسرے شعبہ کا اہم مقصد مدارس شبینہ کا قیام، اُردو زبان کے ذریعہ سے مختلف علوم کی ابتدائی تعلیم اور ایک اُردو ٹریننگ کالج قائم کرکے "ماہرِ اُردو۔ فاضل اُردو۔ کامل اُردو" کی ڈگریاں دینا ہے۔

تیسرے شعبہ کا کام معیاری کتابیں تصنیف کرنا، بہترین تالیفات کی طبع واشاعت میں مدد دینا اور انعامات وغیرہ کے ذریعہ سے طلبہ اور ملک کے نوجوانوں میں تصنیف وتالیف کا ذوق پیدا کرنا ہے۔

کوشش کیجارہی ہے کہ جلد سے جلد یہ ادارہ گورنمنٹ سے رجسٹر کرالیا جائے اگر اہلِ ملک نے بے توجہی سے کام نہ لیا تو اُمید ہے کہ یہ تحریک بہت مفید ثابت ہوگی۔ اسوقت میرے سامنے اس کا تفصیلی لٹریچر موجود نہیں ہے اس لئے اس اجمال سے زیادہ میں اور کچھ عرض نہیں کر سکتا، لیکن جو حضرات اس باب میں تفصیلی معلومات حاصل کرنا چاہتے ہیں وہ جنرل سکریٹری لکھنؤ اُردو اکاڈیمی سے خط وکتابت کریں۔

جنوری ۳۶ء کا نگار جیسا کہ اعلان کیا جا چکا ہے، ہندی شاعری کے لئے وقف ہوگا اور بعض حضرات کے مضامین بھی اس اشاعت کے لئے موصول ہو چکے ہیں، لیکن میں نے اس کو نہایت افسوس کے ساتھ محسوس کیا کہ ہندی زبان کا پرچار کرنے والے اور برج بھاشا پر جان دینے والے ابتک اس منزل پر بھی نہیں پہونچے جن سے اُردو زبان اب سے بیس سال قبل گزر چکی ہے۔

جس حد تک شمار و اعداد کا تعلق ہے ہندی کتابوں اور ہندی رسایل و جراید کی ترقی سے انکار ممکن نہیں لیکن مجھے اس میں کلام ہے کہ ہندی لٹریچر قدر و قیمت کے لحاظ سے بھی اُردو لٹریچر سے آگے بڑھ گیا ہے۔

بعض بڑے بڑے اہل قلم ہندی نگاروں کے مضامین موصول ہوئے ہیں، لیکن اپنے معیار کے لحاظ سے وہ اس درجہ پست ہیں کہ اگر آج اُردو کا کوئی رسالہ ایسے مضامین شائع کرنے پر آجائے تو کوئی آنکھ اُٹھا کر بھی انھیں نہ دیکھے۔ یہ درست ہے کہ ہندی نے حال ہی میں ترقی شروع کی ہے اور اُردو اس سے بہت زیادہ معمر و پختہ زبان ہے، لیکن میں جس کمی کو محسوس کر رہا ہوں اس کا تعلق امتداد زمانہ سے اتنا نہیں ہے جتنا ذوق جمالیات، ذوق فن سے ہے۔ ہندی کے لکھنے والے اکثر وہ ہیں جو کسی نہ کسی مغربی زبان میں اعلیٰ سند حاصل کر چکے ہیں، اسلئے کوئی وجہ نہیں کہ وہ ہندی میں اُس ذوق سے کام نہ لیں جسے انھوں نے کالجوں اور یونیورسٹیوں میں حاصل کیا ہے۔ اس لئے میں سمجھتا ہوں کہ شاید ہندی زبان ہی میں ابھی یہ صلاحیت پیدا نہیں ہوئی کہ وہ کسی بلند ذوق کی چیز کو پیش کر سکے اور اس کے انداز بیان میں وہ تنوع ابھی تک پیدا نہیں ہو سکا ہے جو مختلف مباحث کے لئے مختلف اسلوب ادا کے لئے ضروری ہوا کرتا ہے۔

میں کوشش کر رہا ہوں کہ جنوری ۳۶ء کا نگار بھی جنوری ۳۵ء کے نگار کی طرح کام کی چیز ثابت ہو اور غالباً یہ دیکھ کر آپ کو حیرت ہوگی کہ اس میں بہترین مقالے انھیں کے ہونگے جنپر ہندی زبان کا کوئی حق نہیں ہے۔

زیر طباعت مجموعۂ استفسار و جواب کے متعلق جو خطوط موصول ہوئے ہیں اُن سے معلوم ہوتا ہے کہ لوگوں کا زیادہ رجحان اسی طرف ہے کہ اُسے دو حصوں میں شایع کیا جائے، اس لئے میں بتا دینا چاہتا ہوں کہ دوسرا حصہ تقریباً طیار ہے اور اُمید ہے کہ شروع اکتوبر میں شایع ہو جائے۔ اس کی قیمت بھی خریداران نگار کے لئے دو روپیہ اور غیر خریداران کے لئے تین روپیہ مقرر کی گئی ہے۔ وہ حضرات جو اس کا پہلا حصہ خرید چکے ہیں ان کے لئے دوسرے حصہ کی خریداری کا مسئلہ تقریباً طے شدہ ہے، لیکن جنھوں نے پہلا حصہ بھی نہیں لیا ان کو ضرور اس امر پر غور کرنا ہے کہ دوسرے حصہ کی اشاعت سے قبل پہلا حصہ اُن کو حاصل کرنا چاہئے یا نہیں اور اگر وہ دونوں حصے ساتھ لینا چاہتے ہیں تو ان کو اس کی اطلاع پہلے ہی سے دیدینا چاہئے۔

پارسی اہلِ کتاب ہیں

زرتشتیوں کے ساتھ مسلمانوں کی رواداری

(مسلسل)

تاریخ وسیر کی کتابیں جن کا تعلق اسلام کے دورِ اولین سے ہے صاف صاف اس بات کا اظہار کرتی ہیں کہ زمانۂ ماقبل کے مسلمانوں نے زرتشتیوں کے ساتھ پوری رواداری برتی اور اُنھیں مثل یہود و نصاریٰ کے زمرۂ اہلِ کتاب میں شمار کیا۔ علامہ شہرستانی اپنی مشہور کتاب "الملل والنحل" میں دین زرتشت پر تبصرہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ پیغمبر ایران کی تعلیم میں خدا کی عبادت اور شیطان سے نفرت پر بہت زور دیا گیا ہے اور لوگوں کو امر بالمعروف ونہی عن المنکر کے متعلق تاکید کی گئی ہے"[1]

مناسب ہوگا اگر اس مقام پر مولانا عبدالحق حقانی جیسے زبردست فقیہہ کا خیال بھی پیروانِ پیغمبر ایران کے متعلق ظاہر کیا جائے۔ مولانا فرماتے ہیں کہ:۔ "مجوسی زرتشت ابن بوراسپ کے پیرو ہیں جنھوں نے عہد گشتاسپ بن لہراسپ میں ظہور فرمایا تھا۔ گشتاسپ خود بھی زرتشت کا پیرو تھا۔ اس گروہ کے خیال میں نور اور ظلمت دو مخالف عناصر پر تمامی ہستی کا وجود منحصر ہے۔ خدائے بزرگ و برتر خالقِ کلِّ موجودات ہے۔ نہ تو وہ کوئی شریک رکھتا ہے اور نہ اُس کا کوئی معین و مددگار ہے۔ نور اور ظلمت گویا نیکی و بدی۔ امن و پریشانی۔ پاکبازی اور خباثت کی علامت ہیں۔ ہر چیز اپنی ضد سے پہچانی جاتی ہے۔ زرتشت اُس کتاب کے مصنف یا مبلغ سمجھے جاتے ہیں جس کا نام زند اوستا ہے۔ لوگوں کا خیال یہ بھی ہے کہ یہ کتاب اُن پر بذریعہ الہام نازل ہوئی تھی اُن کی تعلیم کے مطابق کارخانۂ قدرت کے دو رُخ ہیں ایک تو وہ جو پہلے سے مقدر ہو چکا ہے اور دوسرا انسانی اعمال اور کوشش سے ظاہر ہوتا ہے۔

---

[1] فارسی ترجمہ موسومہ توضیح الملل صفحہ ۲۰۳ (نسخۂ خطی امپیریل لائبریری کلکتہ) اس کے ساتھ ہی کتاب تنبیہ الاشراف مولفۂ مسعودی صفحہ ۹۳ بھی ملاحظہ ہو۔

دونوں کے درمیان ایک خاص ربط ہے۔ زرتشت کے خیال کے مطابق تمام مصائب کا باعث خود انسان کا عمل ہے۔ دنیاوی سعادت اور نجات اُخروی کے لئے انسان کے اعتقاد اقوال اور اعمال کا پاک ہونا لازمی ہے اور یہی اصل ایمان ہے[۱]۔" اکثر علمائے اسلام نے زرتشتیوں کا شمار اہلِ کتاب میں کیا ہے[۲]۔ عوام میں جو غلط فہمی انکے متعلق پھیلی ہوئی ہے اس کا اصلی سبب محض ہماری کوتاہ بینی اور تعصب پرستی ہے، جو ہمیں اس مذہب کے اخلاقیات کا مطالعہ کرنے سے معذور رکھتی ہیں۔ اس کے علاوہ زرتشتی ادبیات زیادہ تر ہمارے دسترس سے باہر ہیں۔ اب کچھ عرصہ سے مغربی علماء کی جد وجہد سے زرتشتیوں کی دینی کتابیں ترجمہ ہو کر شائع ہوئیں ہیں اُن کے مذہب پر غور کرنے کا کافی موقع ملتا ہے۔ ان ہی کے ساتھ ساتھ اگر ہم زمانۂ سلف کے مسلمان مورخین اور علماء کی تصنیفات کا بھی مطالعہ کر دیں تو دینِ زرتشت کی اصلی حالت ہمارے سامنے آئینہ ہو جائے گی۔ دبستان مذاہب مولفہ ملا محسن کشمیری میں اس مذہب کے عقاید اور مراسم کا اجمالی احوال درج ہے۔ اور اکثر زرتشتی علماء کے متعلق بھی مفصل ذکر موجود ہے۔ ملا ئے موصوف ایک مشہور مجوسی عالم آذر کیوان کے متعلق فرماتے ہیں کہ لوگ اُنھیں "ذو العلوم" کہتے تھے۔ ادیانِ عالم پر اُن کو کافی عبور حاصل تھا۔ شمس العلماء شبلی نعمانی نے بھی آذر کیوان کے متعلق اپنے مقالات میں تحریر فرمایا ہے کہ وہ مُوحد اور صوفی تھے اور اکثر مسلمان عالم اُن کے شاگرد تھے[۳]۔ اسی طرح ایکدوسرے مجوسی عالم بہرام بن فرہاد کے متعلق دبستان میں تذکرہ ملتا ہے کہ وہ فلسفہ کی ہر شاخ پر عبور رکھتے تھے۔ عربی، فارسی، سنسکرت اور پہلوی زبانوں کی کل کتابیں اُن کے مطالعہ سے گزر چکی تھیں۔ ایک اور عالم موبد سروش کے متعلق صاحبِ دبستان کا بیان ہے کہ خود انھوں نے اُس سے خدا کے وجود کے متعلق دوسو بیس دلیلیں سیکھی تھیں۔

اب ہماری سمجھ سے بالکل باہر ہے کہ ایسے مذہب کے متعلق کیونکر خیال کیا جا سکتا ہے کہ وہ شرک اور کفر کی تعلیم دیتا ہے جس میں اس طرح کے خداشناس اور صاحب فہم بزرگ پائے جاتے ہوں — مشہور مسلم سیاح اور مورخ مسعودی اپنی کتاب مروج الذہب میں لکھتا ہے کہ قرون اولیٰ کے خلفائے اسلام نے زرتشتیوں کے ساتھ بالکل اہلِ کتاب کا سا سلوک کیا اور اُن کے مذہب میں کسی قسم کی مداخلت کبھی نہ کی خود مسعودی نے عراق، کرمان خراسان اور اکثر مقامات کے زرتشتی مرکزوں کو دیکھا تھا جہاں وہ لوگ بلا کسی پابندی اور قیود کے آزادانہ زندگی بسر کرتے تھے۔ مسلمانوں کے ایران فتح کر لینے کے بعد بھی پیروانِ زرتشت عرصہ تک اپنے وطن میں پُرامن

---

[۱] البیان۔ مولفۂ مولانا عبد الحق حقانی صفحہ ۳۵۱۔ (ترجمہ انگریزی)۔ [۲] نکلسن کی تصنیف مطالعات الشعائر اسلامیہ۔ باب دوم۔ صفحہ ۱۶۷۔ اور پروفیسر آرنلڈ کا مقالہ مندرجہ دائرۃ المعارف دین و اخلاق۔ جلد نہم ملاحظہ ہو۔ [۳] مقالات شبلی صفحہ ۳۸۔

زندگی بسر کرتے رہے[1]۔ مسلمانوں کے ہاتھ دولت ساسانی کا استیصال محض سیاسی بنا پر ظہور میں آیا۔ اسے مذہب سے کوئی تعلق نہ تھا[2]۔ ملک پر عربی تسلط ہو جانے کے باوجود وہاں کے نظم و نسق میں تبدیلی تقریباً بالکل نہ ہوئی۔ خراج کی وصولی اور مالیات کے انتظام کے متعلق خود حضرت عمر کے فرمان کے مطابق مشہور ساسانی بادشاہ نوشیروانِ عادل کے اُصول برقرار رکھے گئے[3]۔ شمس العلماء مولانا شبلی مرحوم کا خیال ہے کہ یہ کارروائی قصداً عمل میں آئی۔ اس کے اسباب پر ابن الاثیر اور طبری نے بھی وضاحت سے روشنی ڈالی ہے[4]۔

مرحوم مسٹر نریمان ایک پارسی فاضل فرماتے ہیں کہ "خلفائے اسلام نے عقلمندی سے کام لیکر مجوسیوں کو یہودیوں اور عیسائیوں کے برابر سمجھا اور اُن کا شمار اُن اقوام میں کیا جو کسی مستقل اُصول معاشرت کے حامل تھے[5]"۔ اسی طرح جسٹس سید امیر علی صاحب مرحوم اپنی مشہور عالم تصنیف روح الاسلام میں تحریر فرماتے ہیں۔ "خود معلم مذہب اسلام نے اس امر کی اجازت دیدی تھی کہ مسلمان شادی بیاہ کا رشتہ عیسائی۔ یہودی اور مجوسی اقوام سے جوڑ سکتے ہیں۔" ظاہر ہے کہ اگر مجوسی بھی اہل کتاب میں شمار نہ کئے گئے ہوتے تو اُن کے ساتھ شادی بیاہ کا رشتہ پیدا کرنے کی اجازت کیونکر دیجا سکتی تھی۔ اس جگہ صحیح بخاری کی ایک حدیث کا اشارہ نہایت مناسب ہوگا جس میں مرقوم ہے کہ خود جناب ختمی مرتبت رسول اکرمؐ نے زرتشتیوں کے اہل کتاب ہونے کا صاف اعلان فرما دیا تھا[6]۔ اور اس سلسلہ میں مصنف کتاب تیسیر القاری فی شرح صحیح بخاری نے یہ بھی تحریر فرما دیا ہے کہ امام شافعی اور محدث عبد الرزاق کا بھی خیال تھا کہ زرتشتی اہل کتاب ہیں صحیح بخاری میں ایک مخصوص واقعہ کا بھی اسی مبحث کے متعلق ذکر ہے۔ کہ ایک بار مشہور صحابی رسول احنف جبکہ زرتشتیوں سے جزیہ وصول کرنے میں مصروف تھے تو چند لوگوں نے اعتراض کیا کہ زرتشتی اہل کتاب نہیں اس لئے اُن سے جزیہ لینا ناجائز ہے اس پر احنف نے کہا کہ ہم اتنا جانتے ہیں کہ خود رسول اللہ صلعم نے اس گروہ سے جزیہ لینا قبول فرمایا تھا۔ بات کچھ بڑھی اور پھر یہ مسئلہ حضرت علیؑ کے سامنے آخری فیصلہ کے لئے پیش ہوا۔ جناب امیرؑ نے فرمایا کہ حکم رسول کے مطابق زرتشتیوں کے ساتھ بھی مثل دیگر اہلِ کتاب کے سلوک ہونا چاہئے۔ اس مقام پر یہ بات ذہن نشین کر لینی چاہئے کہ اُس زمانہ میں جزیہ کی مخصوص رقم صرف اُنھیں لوگوں سے وصول کی جاتی تھی جن کے متعلق گمان غالب تھا کہ وہ موحد اور کسی پیغمبر الہٰی کے پیرو ہے۔ اور اس کے معاوضہ میں اُن لوگوں کی حفاظت مسلمانوں پر لازمی تھی اور فوجی خدمات

---

[1] تاریخ ادبیات ایران (براؤن) جلد یکم صفحہ ۲۰۶۔ [2] روح الاسلام مصنفہ جسٹس امیر علی صفحہ ۱۷۰۔ [3] روضۃ الاحباب ۔ تاریخ الفخری۔ صفحہ ۱۰۱ [4] الفخری۔ [5] سیرۃ النعمان صفحہ ۱۲۷۔ [5] ایران و پارسیان۔ جلد اول صفحہ ۸۲۔ اس کے علاوہ آثار خلافتِ راشدہ مولفہٗ ولیم میور صفحہ ۲۰۷ بھی دیکھئے۔ [6] بخاری باب الجزیہ۔ اس کے علاوہ جامع ترمذی جلد اول صفحہ ۵۰۳ (نولکشور پریس) بھی ملاحظہ فرمایئے۔

اُن کے لئے معاف تھیں۔ برخلاف اس کے مشرکین اور کفار سے جنھیں ادیانِ الٰہیہ سے کوئی واسطہ نہ تھا جزیہ قبول نہ کیا جاتا تھا اور وہ اسلامی ممالک کی حدود سے باہر نکالدئے جاتے تھے کیونکہ مسلمانوں کے درمیان اُن کی رہایش خطرناک سمجھی جاتی تھی اور جس کا تجربہ بھی اکثر و بیشتر ہو چکا تھا[لہ]۔

علامہ بلاذری کی مشہور تصنیف فتوح البلدان سے بھی اس امر کی تصدیق ہوتی ہے کہ ہمارے رسول عربی صلعم نے مجوسیوں کے ساتھ اہل کتاب کا سا سلوک فرمایا اور اُن لوگوں سے جزیہ قبول کیا۔ یمن۔ عمان اور بحرین کے ساتھ مخصوص مراعات کا حکم حضرت نے جاری فرمایا تھا۔ پیغمبر اسلام ہی کی تعلیم کے مطابق حبیب ابن مسلم گورنر آرمینیا نے یہودیوں۔ عیسائیوں اور مجوسیوں کو اُن کی حفاظت کا یقین دے رکھا تھا۔ ملا باقر مجلسی ایک شیعی عالم خلافت جناب امیر علیہ السلام کا ایک واقعہ اپنی کتاب حیات القلوب میں یوں نقل فرماتے ہیں[۲ہ]:- ایک دن جناب امیر ممبر پر تشریف لے گئے اور فرمایا پوچھ لو مجھ سے جو کچھ تم لوگوں کو پوچھنا ہو۔ ایسے میں میں ابھی تمہارے درمیان موجود ہوں۔ یہ سُنکر ایک شخص الشعث بن قیس کھڑا ہوا اور کہنے لگا کہ اے امیر المومنین یہ تو فرمایئے کہ آپ مجوسیوں سے جزیہ کیوں لیتے ہیں جبکہ اس کا یقین ہے کہ نہ تو وہ اہل کتاب میں سے ہیں اور نہ اُن کے درمیان کوئی پیغمبر مبعوث ہوا۔ الشعث کے جواب میں حضرت نے فرمایا کہ تمہارا یہ خیال غلط ہے۔ بیشک خدا نے مجوسیوں کے درمیان اپنا پیغمبر بھیجا اور اُن پر ایک کتاب نازل فرمائی۔

ایک دوسرے شیعی فاضل مولانا سید محمد ہارون اپنی تصنیف توحید الائمہ میں زرتشتی مذہب کے متعلق تبصرہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ جہاں تک وحدانیت باری کا تعلق ہے زرتشتی تعلیم کو کل دیگر مذاہب کے عقاید پر بعد اسلام کے فوقیت حاصل ہے۔ قاضی ابو یوسف اپنی کتاب الخراج میں ایک جگہ تحریر فرماتے ہیں کہ پیغمبر اسلام نے زرتشتیوں سے مثل اہل کتاب کے جزیہ تو قبول فرمایا تھا مگر یہود و نصاریٰ کی طرح اُن سے شادی بیاہ کرنے کی ممانعت فرمائی تھی کیونکہ مجوسی مشرک ہیں۔

اگرچہ ہمارے پاس قاضی صاحب کے اس بیان کی تردید کے لئے کافی سے زیادہ مواد موجود ہے تاہم بفرض محال یہ صحیح بھی ہو تو ہم یقین کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ حضرت سرور کائنات کا حکم مانی و مزدک کے پیرووں کے متعلق ہوگا جو بظاہر میں مجوسی ہی خیال کئے جاتے تھے اور جن کی اُس وقت بلاد اسلامیہ میں کثرت تھی۔ یہی جماعت ادبیات اسلامی میں اکثر زندیق کے نام سے بھی یاد کی گئی ہے اور جو درحقیقت خدا کے وجود کے بھی قایل نہ تھے[۳ہ]۔ اس کے ساتھ ہی ساتھ ہم یہ بھی عرض کرنے پر مجبور ہیں کہ اگر صاحب کتاب الخراج کے خیال میں زرتشتی گروہ پر شرک کا اطلاق ہو سکتا ہے تو پھر یہود و نصاریٰ اُن سے زیادہ مشرک کہے جا سکتے ہیں ایک طرف تو یہودیوں کی قوم عُزیر کے خدا ہونے کی قائل نظر آئی اور دوسری جانب عیسائیوں میں تثلیث پرستی رائج ہوئی۔ مگر ہم دیکھتے ہیں کہ ان باتوں کے باوجود ہر دو گروہ کو

لہ خلافت۔ مولفۂ میور صفحہ ۳۵۵۔ ۲ہ نسخۂ خطی (بانکی پور لائبریری) صفحہ ۲۷۸ الف۔ ۳ہ کتاب الفہرست (ابن ندیم) ص ۳۲۷۔

قرآن شریف میں اہل کتاب کہکر مخاطب کیا گیا اور شریعتِ اسلامی نے ان کے ساتھ اکل و شرب۔ نکاح و شادی جائز قرار دیا۔

حقیقت تو یہ ہے کہ جناب سرور کائنات صلعم نے ایرانیوں کی جانب ہمیشہ بنظر التفات دیکھا اور اکثر و بیشتر موقعوں پر عہد نوشیروانِ عادل میں اپنی ولادت باسعادت کے واقعہ کا ذکر افتخار کے ساتھ فرمایا[۱]۔ صاحب نزہتہ القلوب آنحضرت سے یہ حدیث بھی نقل فرماتے ہیں کہ بہ تحقیق خدا نے عربوں کے درمیان سب سے بہتر قوم اہل قریش کو بنایا اور عجمیوں (غیر عرب) میں سب سے بہتر مخلوق ایرانیوں کو قرار دیا[۲]۔ سلمان فارسی کی ارادت اور خلوص و پاکبازی کا خیال فرماتے ہوئے آپ نے اُنھیں اپنے اہل بیت میں شامل فرمایا اور اکثر اہم موقعوں پر اُن سے مشورہ فرمایا کرتے تھے[۳]۔

فتوح البلدان میں مذکور ہے کہ جب رسولِ اکرم صلعم نے مجوسیوں کو اہل کتاب گردان کر اُن سے جزیہ لینا جائز فرمایا تو کچھ لوگ منافقین میں سے کہنے لگے کہ محمد نے اُنھیں اہل کتاب سمجھنے میں غلطی کو راہ دیا۔ بلاذری کا بیان ہے کہ اُسی وقت یہ آیت نازل ہوئی جسے حضرت نے لوگوں کے درمیان تلاوت فرمائی۔" اے وہ لوگ جو ایمان لائے ہو اپنے افعال پر نظر کرو۔ غلطی کرنے والا تمھیں کوئی نقصان نہیں پہونچا سکتا۔ تم خدا ہی کی طرف واپس جاؤ گے اور جس بات کو تم نہیں جانتے ہو وہ تمھیں سمجھا دے گا۔" (سورۂ پنجم آیۃ ۱۰۴)

یہ تو ایک بدیہی بات ہے کہ قرونِ اولیٰ کے مسلمانوں نے یہودیوں، عیسائیوں اور زرتشتیوں کے ساتھ نہایت روادارانہ سلوک جائز رکھا۔ خود پیغمبر اسلام نے اپنے مسلک کی تبلیغ ہمیشہ نہایت پُرامن طریقہ پر فرمائی۔ یہانتک کہ کفار کے ساتھ بھی اگر جنگ کی تو محض مدافعانہ۔ مسلمانوں نے اسلحہ اُسیوقت اُٹھائے جب وہ اس کے لئے مجبور کئے گئے۔ تبلیغ کے سلسلہ میں اگر کوئی جماعت کسی طرف بھیجی گئی تو اُن لوگوں کو رسول اللہ کی مخصوص ہدایت تھی کہ لوگوں کے ساتھ اخلاق و انکسار کے ساتھ پیش آئیں۔ اور ہمیشہ امن و امان سے کام لیں۔ صاحب مروج الذہب لکھتے ہیں[۴] کہ ایک بار خالد بن ولید حضرت کے حکم سے قبیلۂ خزیمہ کی طرف بغرض تبلیغ بھیجے گئے۔ قبیلہ والوں سے اور خالد سے کسی بات میں تکرار ہو گئی۔ اور موخر الذکر نے تقریباً ایکسو آدمیوں کو اُسی قبیلہ کے قتل کرا ڈالا۔ جیسے ہی یہ خبر رسول اللہ صلعم کے پاس پہونچی تو آپ چیخ اُٹھے " یا ربّ ہم خالد کے اس فعل کے ذمہ دار نہیں۔ ہم اسے

---

[۱] تاریخ ادبیات ایران (براؤن) جلد یکم صفحہ ۱۶۶۔ ناسخ التواریخ۔ جلد دوم۔ صفحہ ۳۶۵ — [۲] نسخہ خطی (بانکی پور لائبریری) صفحہ ۱۳ (ب) — [۳] مجالس المومنین مصنفہ قاضی نور اللہ شوستری — [۴] نسخہ خطی (بانکی پور لائبریری) صفحہ ۱۶ الف اسکے علاوہ ملاحظہ ہو سیرۃ النبی جلد دوم صفحہ ۱۰۲ مولفہ مولانا شبلی۔

نفرت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں اور تیری پناہ مانگتے ہیں۔" اس کے بعد فوراً ہی آپ نے حضرت علی کو قصاص کا روپیہ دیکر قبیلہ خزیمہ کے پاس بھیجا اور اُن سے دوستانہ سلوک کرنے کی جناب امیر کو تاکید کی اور جب تک کہ قبیلہ مذکور نے خالد کو معاف نہ کر دیا رسول اللہ نے اُن سے بولنا ترک فرما دیا تھا۔ جناب سرورِ کائنات کے عہد میں جو کچھ معاہدے یہودیوں عیسائیوں اور زرتشتیوں کے ساتھ کئے گئے تھے اُن کی پابندی خلافت راشدہ تک کی گئی اور "ذمیوں" کی جماعتیں اپنے رسومات ادا کرنے میں آزاد رہیں۔[۱] عدالتوں میں قاضی نے اُن کے ساتھ مثل مسلمانوں کے انصاف کیا۔ مثال کے لئے ہم ایک واقعہ عہد جناب امیر کا پیش کرتے ہیں۔ کسی یہودی نے حضرت پر ایک دعویٰ کیا جو سراسر جھوٹ تھا۔ جناب امیر اپنی بریت میں کافی ثبوت قاضی کے سامنے پیش نہ کر سکے چنانچہ فیصلہ بھی امیر المومنین کے خلاف ہوا جسے حضرت نے بخوشی قبول بھی فرما لیا۔ اگرچہ بعد کو یہودی حضرت کی اس عدالت گستری کو دیکھ کر اپنے دعوے سے باز آ گیا اور حقیقت حال کا اقرار کر لیا۔[۲]

جنگ نہاوند کے بعد جب ایرانی اسیروں کی جماعت کے ساتھ آخری ساسانی تاجدار کی بیٹی شاہزادی شہر بانو دربار خلافت میں پیش ہوئیں تو حضرت عمر نے اُن کا حال سُنکر فوراً قید سے رہا فرما دیا[۳] اور جناب علی مرتضیٰ نے خاندان کسریٰ کی شان برقرار رکھنے کے لئے اپنے فرزند امام حسین کے ساتھ شہر بانو کا عقد فرما دیا۔ چنانچہ الیعقوبی کہتا ہے کہ ان دو بزرگ خانوادوں کے اتحاد سے امام حسین کے بعد بقیہ ائمہ اثنا عشر کا سلسلہ چلا اور غالباً یہی وجہ ہوئی کہ ایران میں لوگوں کا رجحان زیادہ تر بنی فاطمہ کی طرف رہا۔[۴] حُسنِ اتفاق دیکھئے کہ مسلمانوں کی ایک دوسری کثیر التعداد جماعت یعنی احناف بھی تقلیداً ایران کی سرزمین سے گہرا تعلق رکھتے ہیں۔ امام ابو حنیفہ ایرانی النسل تھے اور بقول شمس العلما شبلی نعمانی مرحوم امام صاحب کے دادا بعہد جناب امیر کوفہ میں آکر سکونت پذیر ہوئے۔[۵] یہ بزرگ اپنے آبائی وطن سے باہر جاکر بھی اپنی قومی عید (نوروز) کو کبھی نہ بھولے۔ چنانچہ ایک بار نوروز کے موقعہ پر آپ نے فالودہ تیار کر کے جناب امیر کی خدمت میں پیش فرمایا تھا اور جسے حضرت نے بخوشی قبول بھی کر لیا تھا۔[۶] خود امام ابو حنیفہ کو ایرانیت سے خاص دلچسپی تھی یہاں تک کہ آپ نے نمازوں میں اکثر سورتوں کے متعلق فارسی زبان میں (بجائے عربی کے) تلاوت کی اجازت دے رکھی تھی۔[۷] امام صاحب کے نزدیک ایک ذمّی کا خون اتنی ہی اہمیت رکھتا تھا جس قدر کہ ایک مسلمان کا خون۔ عدالت کے سامنے مسلمان اور ذمّی دونوں کا درجہ برابر تھا۔[۸]

---

[۱] کتاب الخراج (ابو یوسف) صفحہ ۷۰۔ [۲] البیان (مولفۂ مولانا عبد الحق حقانی) صفحہ ۲۹۶۔ [۳] الفخری صفحہ ۹۹۔ تاریخ الاسلام مولفۂ عباسی صفحہ ۱۹۴۔ فتوحات عجم (الواقدی) صفحہ ۱۶۸۔ وغیرہ۔ [۴] نریمان کی کتاب ایران و پارسیان صفحہ ۲۰ بھی ملاحظہ ہو۔ [۵] سیرۃ النعمان۔ [۶] سیرۃ النعمان۔ [۷] سیرۃ النعمان۔ [۸] سیرۃ النعمان۔

مجوسیوں کے ساتھ روادارانہ سلوک کے متعلق مصنف الکرار جناب امیر کے زمانہ کا ایک واقعہ بیان کرتے ہیں کہ حضرت کو جب خبر ملی کہ آپ کا ایک عامل مجوسیوں پر سختی کرتا ہے تو فوراً ہی آپ نے اُسے سختی کے ساتھ ہدایت نامہ تحریر فرمایا اور تنبیہہ کی کہ عموماً کل ذمیوں اور خصوصاً مجوسیوں کے ساتھ مہربانی اور نرمی کا سلوک کرو۔ حضرت علی نے اپنے لشکر میں بھی اعلان فرما دیا تھا کہ اگر کسی سپاہی نے ذمیوں کے ساتھ کسی قسم کی سختی کی تو اُس کے ساتھ بھی ویسا ہی سلوک کیا جائے گا۔

اگر ہم کوشش کریں تو ایسے فرامین کثرت سے ملیں گے جنہیں جناب امیر نے یہودیوں۔ عیسائیوں اور زرتشتیوں کے ساتھ روادارانہ سلوک کا حکم فرمایا تھا۔ ابھی تھوڑا عرصہ ہوا کہ انجمن زرتشتیان بمبئی اور ایران لیگ نے چند اسی قسم کے فرامین کا مجموعہ (عہد نامے) شایع بھی کیا تھا اور جس کے متعلق مسلمانوں کے ایک ادبی ماہوار رسالہ میں تبصرہ کرتے ہوئے ایک صاحب نے اُن کی اصلیت ہی سے قطعی طور پر انکار فرمایا تھا[۱]۔ ممکن ہے کہ صاحب موصوف اپنی جگہ پر بالکل صحیح ہوں مگر اس حقیقت سے تو انکار کم از کم ہو نہیں سکتا کہ قرون اولیٰ کے مسلمان ذمّی اقوام کے ساتھ بہر طور رواداری کا برتاؤ کرتے تھے اور خلافت راشدہ کا زمانہ[۲] اس خصوصیت کے لئے ممتاز ہے۔ کتاب معروف فتوح البلدان میں اکثر ایسے صلحناموں اور معاہدوں کی نقلیں ہمیں ملتی ہیں جو جناب ختمی مرتبت صلعم نے اپنے اکابر صحابہ کے ذریعہ یہود و نصاریٰ اور مجوسیوں کے ساتھ طے فرمایا تھا۔ ان میں رواداری کی خاص شان نمایاں ہے اسی طرح نہج البلاغہ میں جناب امیر کے اُن احکام کی نقل ملیگی جو آپ نے ذمیوں کے ساتھ اچھے سلوک کرنے کے متعلق اپنے عمال کے نام صادر فرمائے تھے۔

بہر کیف جب تک سلاطین اسلام اپنے ہادی و رہبر کے احکام پر عامل رہے ایران کی حالت اچھی رہی اور یہاں کے باشندے۔ مسلم اور غیر مسلم ہر دو خوش حالی سے بسر اوقات کرتے نظر آئے۔ عباسیوں کے عہد میں تو دربار خلافت پر ایرانی اثر غالب آ چکا تھا[۳]۔ فارسی زبان گویا درباری زبان کا درجہ حاصل کئے تھی۔ قدیم ایرانی ادبیات کا عربی زبان میں ترجمہ کرنے کے لئے حکومت کی طرف سے ایک خاص شعبہ قائم کیا گیا تھا[۴]۔ چنانچہ علامہ ابن ندیم نے اپنی کتاب الفہرست میں[۵] مترجموں کی خاصی تعداد کا ذکر لکھا ہے۔ خلیفہ منصور کے عہد میں بہت سے زرتشتی علماء قدیم ایرانی کتابیں جمع کرنے پر مقرر تھے اور مسعودی کا بیان ہے[۶] کہ اکثر مسلمان فضلاء مثلاً ابن ابی الارجاع۔ یحییٰ بن زیاد۔ مطیع بن ایاس وغیرہ نے

[۱] معارف (اعظم گڈھ)۔ [۲] مقالہ نوشتۂ ابو المحاسن محمود علی صاحب (نگار۔ مارچ ۱۹۲۷ء) اور کتاب "خلافت" (مولفہ میور) صفحہ ۴۵۶۔ ملاحظہ فرمایئے۔ [۳] رسائل شبلی صفحہ ۲۳۔ دینیات زرتشتی (مصنفہ ڈاکٹر دہالا) صفحہ ۲۹۹۔ [۴] صفحات ۲۴۴۔۲۴۵ (مطبوعہ فلوگل)۔ [۵] مروج الذہب (ذکر سلطنت القاہر باللہ)

ایرانیوں کی مذہبی ادبیات کے متعلق کتابیں تصنیف کیں۔ بلاشبہ عباسیوں کے زمانہ میں ایرانیوں نے وہ سب کچھ حاصل کر لیا تھا جو جنگ نہاوند و قادسیہ میں اُن کے ہاتھوں سے نکل جا چکی تھیں [1]۔ ہارون و مامون کے کل وزراء ایرانی یا ایرانی النسل تھے [2] اور اُن میں کے اکثر مجوسی۔ شمس العلماء شبلی تحریر فرماتے ہیں کہ [3] "مامون الرشید کو زرتشتی علماء سے خاص ارادت تھی۔ ایک مجوسی عالم یزدان بخت مرو سے کسی مذہبی جلسہ میں شرکت کے لئے بغداد آیا تو مامون نے خاص احترام کے ساتھ اُس کا استقبال کیا اور اپنے محل کے قریب رہنے کے لئے جگہ دی۔

ایک مشہور مسلمان عالم لکھتے ہیں کہ [4] "عباسیوں کے عہد میں اکثر مقامات پر مجوسیوں کے معبد پائے جاتے تھے اور پیروان زرتشت سے جس رواداری کا برتاؤ کیا جاتا تھا اس کا اندازہ اسی امر سے بخوبی ہو سکتا ہے کہ جب مامون نے حکومت کے انتظام کے لئے ایک مجلسِ مشورت قائم کی تو زرتشتیوں کو اپنا نمائندہ بھیجنے کی مخصوص ہدایت کی۔

ایران پر عربی تسلط ہو جانے کے ایک عرصہ بعد پارسیوں (مجوسیوں) کی ایک کثیر تعداد نے ہندوستان کا رُخ کیا اور یہیں آ کر آباد ہو گئے۔ اس ہجرت کے کئی اسباب ہیں۔ ہم یہ مانتے ہیں کہ زرتشتیوں کے لئے اُن کے آبائی وطن میں قومی حکومت کے ختم ہو جانے کے بعد پہلی سی بات باقی نہ رہی تھی تاہم وطن چھوڑ کر دوسرا ملک بسانے میں کچھ اور بھی مصلحتیں اُن کے پیشِ نظر تھیں۔ اُن کی تجارت پسند طبیعت نے انھیں مجبور کیا کہ وہ ہندوستان کی پُرامن فضا کی طرف توجہ کریں۔ ایران کی سرزمین اُن فرمانروایان اسلام کے ہاتھوں خانہ جنگی کا شکار ہو رہی تھی جو اپنے رسول اور اُنکی شریعت سے غافل ہو چکے تھے اور جہاں غیر مسلم اقوام کے علاوہ خود مسلمانوں کی حالت تباہ تھی۔

یہ حقیقت کہ پارسیوں کی وطن سے ہجرت کے بعد بھی ایک کافی تعداد مجوسیوں کی ایران میں بدستور جاگزیں رہی [5] اور ہندوستانی زرتشتیوں اور اُن کے ایرانی ہم مذہبوں کے درمیان دینی تعلقات برابر قائم رہے جیسا کہ سلسلۂ "روایات" [6] سے ظاہر ہے اس امر پر کافی دلالت کرتی ہے کہ اس مہاجرت میں مسلمانوں کے مذہبی تعصب کو کم دخل تھا۔

گزشتہ صفحات میں پیغمبر ایران اور اُن کی تعلیمات کے متعلق کوئی نئی بات بیان نہیں کی گئی۔ دنیا اب بہت کچھ ترقی کر چکی ہے۔ موجودہ زمانہ تحقیق اور بلند خیالی کے لئے معروف ہے۔ مذہبی تعصب اور تنگ نظری سے اب کام نہیں لیا جا سکتا۔ علمائے مغرب نے زرتشتی ادبیات کے ترجمہ و تحشیہ کے سلسلہ میں جیسی کاوشیں کیں وہ ہر طرح لائق تحسین و تشکر ہے۔ بلاشبہ اوائل میں اکثر عرب مصنفین نے بھی اس طرف توجہ ضرور کی اور جس کا مفصل پتہ ہمیں ایک روسی

---

[1] ہند در زمنِ وسطیٰ (لین پول) وغیرہ۔ [2] الفخری صفحہ ۲۶۵-۲۶۳۔ [3] الکلام جلد اول صفحہ ۴۲۔ [4] مقالہ نوشتہ مولوی حمید احمد خاں (رسالہ ہمایوں۔ مئی ۱۹۲۶ء)۔ [5] گنجینۂ مغاں (مولٹن) صفحہ ۱۲۳-۱۲۲۔ [6] تاریخ ادبیات ایران (براؤن) جلد اول صفحہ ۲۰۶۔

عالم کی تصنیف سے ملتا ہے[1]۔ مگر افسوس ہے کہ مسلم مصنفین اور مورخین کی کتابیں قومی اور مذہبی تعصبات سے پاک نہیں نظر آتیں۔ ان میں سے اکثر نے زرتشت کی تعلیم کا بالکل مخالف پہلو پیش کیا ہے۔ پھر بھی باوجود ان خامیوں کے ہم اُن کے شکرگزار ہیں کہ ایسی حالت میں جبکہ قدیم ایرانی تمدن و تہذیب سے باخبر ہونے کا ہمارے پاس سوائے شاہنامہ فردوسی کے کوئی دوسرا ذریعہ نہیں اِن فضلائے مشرق نے ہمیں کسی قدر حالات سے مطلع کیا۔ مغربی محققین کے نزدیک شاہنامہ کی تاریخی حیثیت محض اتنی ہی ہے کہ اس کی قومی روایات پر بنیاد ہے۔ لیکن ہم جب اس بے مثال مثنوی کے بیانات کا مقابلہ مسعودی، طبری، یعقوبی، حمزہ اصفہانی، دیناوری وغیرہ جیسے اہم مورخین کی مصنفات سے کرتے ہیں تو فردوسی کو کسی مقام پر تاریخی واقعات سے منحرف نہیں پاتے۔ مرحوم مولانا شبلی کے خیال میں اہل مغرب کے نزدیک شاہنامہ کی تاریخی حیثیت محض اُس کے غیر فطری قصص و حکایات کے سبب پست نظر آتی ہے مگر جیسا کہ مولانا موصوف نے اس کی رد میں فرمایا ہے خود ہیروڈوٹس یونانی نے جسے لوگ تاریخ نویسی کا باوا آدم جانتے ہیں اپنی تصانیف میں ایسے ایسے ہزاروں یقین میں نہ آنے والے قصص و حکایات کا ذکر کیا ہے[2]۔ حقیقت امر یہ ہے کہ فردوسی کا مقصد واقعات کو اُن کی اصلی صورت میں پیش کردینا تھا جیسا کہ اُس نے اپنی ملکی اور قومی روایات میں پایا تھا۔ چنانچہ نہ محض یہ کہ نالدیکی۔ موہول۔ براؤن وغیرہ جیسے مشہور مستشرقین نے اس بات کا اظہار کردیا ہے کہ فردوسی نے شاہنامہ میں قدیم روائتیں نہایت دیانت کے ساتھ نظم کیں بلکہ اس کی تصدیق یوں بھی ہوجاتی ہے جب کہ ہم شاہنامہ کا تقابل ادبیات پہلوی سے کرتے ہیں۔ بقول ابن الاثیر عربی ادبیات باوجود اسکے کہ لغات العرب میں کثرت اور کافی سے زیادہ وسعت ہے شاہنامہ جیسی گراں بہا اور عظیم الشان کتاب کے وجود سے خالی ہیں[3]۔

بہرطور اب ہم دین زرتشت اور اُس کے پیرووں کے متعلق ایک نئے دور کے آغاز کا کچھ حال بیان کردینا مناسب سمجھتے ہیں۔ مجوسیوں نے قومی حکومت کے استیصال کے بعد موجودہ صدی کے اوائل تک انقلابات گوناگوں کا مقابلہ کیا یہاں تک کہ اُن کی ایک کثیر تعداد نے وطن سے مُنھ موڑ کر ہندوستان کو بسایا۔ مگر اب کہ ایرانی سلطنت کی باگ ایک ایسی ہستی کے ہاتھوں میں آئی جس کے پیش نظر محض ملکی اور قومی ترقی ہے اور جسے مذہبی عصبیت سے کچھ بھی تعلق نہیں ہم دیکھتے ہیں کہ موجودہ ہندوستانی پارسی (زرتشتی) اپنے آبائی وطن ایران سے تعلقات کی تجدید میں سرگرم ہیں۔ چنانچہ باوجود اس کے کہ حکومت برطانیہ کے زیر سایہ ہندوستان میں ان پارسیوں نے نہایت پُرامن زندگی بسر کی اور یہ ملک ایک طور پر اُن کا وطن بن گیا اُن کے دلوں میں قدیم آبائی مسکن کی یاد پھر تازہ ہورہی ہے

[1] اسلامی ادبیات پر ایرانی اثر (مولفہ آئی ذوسترا نڈریو) مترجمہ جی کے قربان۔ [2] شعرالعجم جلد اول صفحہ ۱۲۷۔ [3] شعرالعجم صفحہ ۱۲

کوشش کی جارہی ہے کہ وہ اپنے سرمایہ سے ایران کی خدمت کے لئے تیار ہوجائیں اور ممکن ہے کہ آیندہ یہ جماعت پھر اپنے اصلی وطن میں سکونت اختیار کرلے۔ اعلیحضرت رضا شاہ پہلوی کی حکومت یوں تو بالعموم کُل ایرانیوں کے لئے بلا تفریق مذہب باعث رحمت ہے مگر زرتشتیوں کے لئے مخصوص ایسے مراعات ہیں جو اُنھیں آج تک بعد زوالِ دولت ساسانی نصیب نہ ہوئی تھیں۔ ایران کی مجلس (پارلیمنٹ) میں نہ محض یہ کہ اُن کا بھی نمایندہ موجود ہو بلکہ بڑے بڑے عہدوں پر آج متعدد مجوسی نظر آتے ہیں اور اُن کے گروہ کو ہر قسم کی دینی و دنیاوی آزادی حاصل ہے۔ یزد و کرمان میں جہاں ان کی کثرت ہے ہم دیکھتے ہیں کہ ایران و ہندوستان کے زرتشتی سرمایہ سے، مدرسے، یتیم خانے، مریض خانے، مسافر خانے کثیر تعداد میں موجود ہیں اور دن بدن اُن میں اضافہ ہوتا جاتا ہے۔ اُن کے دلوں میں مسلمانوں کی جانب سے جو کدورت تھی اُس میں نمایاں کمی نظر آتی ہے اور خود مسلمان اُن کی دلجوئی میں پیش پیش دکھلائی دیتے ہیں۔

محمد طاہر رضوی ایم۔اے

بلیک ڈائمنڈ

ہندوستان کا واحد بے ضرر خضاب

اسوقت بازار میں مختلف ناموں کے خضاب بکثرت نظر آتے ہیں لیکن یہ تمام خضاب ایک ہی چیز ڈایامین سے طیار ہوتے ہیں جو بے انتہا ارزاں چیز ہے، لیکن اس کے استعمال کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ چند دن کے بعد چہرہ پر آماس آجاتا ہے، نزلہ کی شکایت پیدا ہوجاتی ہے، جلد پر دانے پڑکر زخم کی صورت اختیار کرلیتے ہیں اور بعض مرتبہ جب اس کا زہر آہستہ آہستہ خون میں پوری طرح سرایت کرجاتا ہے، ہلاکتیں بھی ہوجاتی ہیں، کیونکہ ڈایامین نہایت ہی مہلک قسم کا زہر ہے اور صرف چمڑا رنگنے کے کام میں لایا جاتا ہے ــــ ہمارا خضاب ڈایامین یا کسی اور زہریلی چیز سے بالکل پاک ہے اور اس کے استعمال سے کبھی کوئی شکایت پیدا نہیں ہوسکتی ــ یہ بالوں کو اصلی سیاہ رنگ دیکر اُن کی چمک اور مضبوطی کو بھی قائم رکھتا ہے اور جلد پر دھبے نہیں آنے دیتا ــ قیمت علاوہ محصول ایک بکس ۹/ ـ ایک شیشی میں محصول ۶/ صرف ہوجاتا ہے، اس لئے جتنی زیادہ شیشیاں طلب کی جائیں گی اتنا ہی فائدہ ہوگا ــ ہر شہر میں ایجنسیاں درکار ہیں ــــ کمیشن کے متعلق خط و کتابت کیجئے ــــ

کارخانہ خضاب بلیک ڈائمنڈ لکھنو

جھانسی کی رانی

(مسلسل)

دوسرا ایکٹ - پہلا منظر

یکم مارچ ۱۸۵۴ء بوقت سہ پہر گورنمنٹ ہاؤس کلکتہ کے جنوبی حصہ میں گورنر جنرل کی اگزکٹو کونسل کا اجلاس ہو رہا ہے۔ جس میں گورنر جنرل اور چار معمولی ممبر موجود ہیں۔ کمرہ وسیع، مربع اور بلند ہے۔ پچھلی دیوار میں دو بلند کھڑکیاں ہیں جن سے خانہ باغ نظر آرہا ہے۔ ایک لمبا پنکھا ہاتھ سے کھینچنے والا لٹکا ہوا ہے۔ جس کے نیچے ایک ہلالی میز بچھی ہوئی ہے۔ میز کے پیچھے ایک سُرخ کرسی کسی قدر بلند رکھی ہوئی ہے۔ میز کے داہنے اور بائیں تین تین کرسیاں اور ہیں۔ کمرہ مختلف قسم کے سامان سے آراستہ ہے۔ بلند کرسی کے سامنے وارن ہسٹنگز کی قد آدم تصویر آویزاں ہے۔ ہر کرسی کے سامنے بڑی بڑی دواتیں، کاغذ اور پر کے قلم سجے ہوئے ہیں۔ اونچی کرسی لارڈ ڈلہوزی گورنر جنرل کی ہے۔ اس کے داہنی طرف گورنمنٹ سکریٹری مسٹر جے۔ پی۔ گرانٹ کی نشست ہے جس کے آگے سرکاری کاغذات کا ڈھیر ہے۔ بائیں طرف کونسل کے سینئر ممبر مسٹر جے۔ اے ڈورین کی نشست ہے اور اس کی بائیں ہاتھ مسٹر ہالیڈے ممبر کونسل کی کرسی ہے۔ سکریٹری کے داہنی طرف کرنل جان لو کی کرسی ہے۔ یہ اینگلو انڈین وضع کے ایک شگفتہ مزاج اور تنومند انسان ہیں۔ اور دیگر انگریزوں سے کسی قدر مختلف نظر آتے ہیں کیونکہ اگرچہ ان کا لباس صحیح انگریزی قطع کا ہے لیکن دیسی کپڑے کا اور یہیں کا سلا ہوا ہے۔ کالر کے بجائے ان کے گلے میں ہندوستانی ریشم کا گلوبند ہے۔ عمر اگرچہ ساٹھ سال کی ہے لیکن کاٹھی اچھی ہے۔ دوسرے انگریز گلمچھے رکھے ہوئے ہیں مگر کرنل صاحب کی داڑھی مونچھ صاف ہے۔ چھوٹا سا چاندی کا حقہ ہاتھ میں ہے اور وہ باتیں کرتے

کرتے کش لگاتے رہتے ہیں۔ لارڈ ڈلہوزی، پستہ قد، نازک اندام مگر ستعلیق وضع کا آدمی ہے۔
چہرہ سے متانت اور امارت برستی ہے۔

پردہ اُٹھتا ہے تو میسرز ڈورین، ہالیڈے اور گرانٹ اپنی اپنی جگہ بیٹھے اور گپ شپ کرتے نظر آتے ہیں۔ مگر گرانٹ سرکاری کاغذات کا بھی مطالعہ کرتا جاتا ہے۔ پنکھا بند ہے۔

ڈورین :۔ میں امید کرتا ہوں کہ آج پھر مسٹر لو (Low) اپنے آپ کو بیوقوف ثابت نہیں کریں گے۔ میں نے انھیں سمجھا دیا ہے کہ ہز ایکسلنسی گورنر جنرل برہما سے نہایت خستہ و پریشان واپس آئے ہیں۔ اور وہ لغو باتیں سننا پسند نہیں کریں گے۔

ہالیڈے :۔ میں آج تک نہیں سمجھ سکا کہ لو کے دل میں کیا سمائی ہے کہ وہ ہمیشہ گورنر جنرل سے جھگڑا کرتا رہتا ہے، میں انھیں ہمیشہ سمجھاتا رہتا ہوں کہ جو بات لارڈ ڈلہوزی کے دل میں سما جاتی ہے وہ اس کو پورا کر کے رہتے ہیں، اس لئے اس معاملہ میں ان کی مخالفت کرنا بے سود ہے۔ مجھ سے زیادہ لارڈ ڈلہوزی کو اور کوئی نہیں جانتا۔ وہ اس قسم کے آدمی ہیں کہ ہمیشہ اپنے دل کی بات کرتے ہیں اور اب جبکہ جدید قانون کے ذریعہ سے گورنر جنرل کو یہ اختیار حاصل ہو گیا ہے کہ اگر وہ چاہے تو اپنے کونسلروں کی نہ مانے، تو وہ اپنے دل کی بات آئینی طور پر بھی پوری کر سکتے ہیں۔ مگر یہ کمبخت لو کچھ دیکھتا ہی نہیں، وہی پرانا راگ الاپے جاتا ہے کہ لارڈ ایلنبرا اور لارڈ ہیٹنگ نے یہ کہا تھا اور لارڈ منٹو اور لارڈ الفنسٹن نے یہ کیا، بھلا یہ کونسی عقل کی باتیں ہیں۔

ڈورین :۔ مسٹر گرانٹ! اب مسٹر لو کی پنشن میں کتنے دن باقی رہ گئے ہیں؟۔ اگر وہ موجودہ حکومت سے غیر مطمئن ہیں تو کیوں اپنی پنشن کے کاغذات پیش نہیں کر دیتے۔

گرانٹ :۔ فوجی پنشن تو ان کو فوراً مل سکتی ہے کیونکہ اب ان کی عمر ساٹھ برس کی ہو گئی ہے۔ رہا معاملہ سول پنشن کا تو جتنے سال وہ محکمہ سول میں کام کریں گے اسی نسبت سے انھیں پنشن کا استحقاق ہو گا۔

ڈورین :۔ اچھا اگر آج بھی انھوں نے حسب معمول وہی باتیں کیں تو میں ان سے بھری کونسل میں صاف صاف کہدوں گا کہ اگر آپ گورنمنٹ کی پالسی سے موافق نہیں ہیں تو مستعفی ہو جایئے۔ میں یقین کرتا ہوں کہ اگر پوری کونسل نے میری تائید نہ بھی کی تو لارڈ ڈلہوزی ضرور میرا ساتھ دیں گے۔ علاوہ ازیں مجھے کرنل لو کی یہ بات سخت ناگوار گزرتی ہے کہ جب کبھی اختلاف ہوتا ہے تو وہ اپنے اور گورنر جنرل کے درمیان مجھے حکم قرار دیتے ہیں۔ میں علحدگی میں کرنل سے بار بار کہہ چکا ہوں کہ لارڈ ڈلہوزی جیسے ہمالیہ پہاڑ سے ٹکرا کر میں انگلستان میں اپنا مستقبل خراب کرنا نہیں چاہتا مگر ان کی سمجھ ہی میں نہیں آتا۔

ہالیڈے :۔ حقیقت تو یہ ہے کہ گورنر جنرل پر کسی قسم کا اثر ڈالنے کا ہمارے لئے موقعہ ہی نہیں۔ وہ اپنی کونسل کو

ایسا سمجھتے ہیں گویا وہ ان کے فیصلوں پر صاد کرنے کی ایک مشین ہے۔ وہ ہماری رائے کو ٹھکرا سکتے ہیں اور فی الحقیقت وہ ہمیشہ ایسا کرتے ہیں۔ پھر جو تدابیر بہر صورت کی جانے والی ہیں یا جو کارروائیاں کسی نہ کسی طرح ہونے والی ہیں ان کی مخالفت کرنا کونسی دانشمندی ہے؟

ڈورین :۔ (گھڑی دیکھ کر) ۔اب کام شروع ہونا چاہئے تھا۔ ہز اکسلنسی نے کتنی دیر کے بعد آنے کو فرمایا تھا؟

گرانٹ :۔ (گھڑی دیکھ کر) ۔ انھوں نے فرمایا تھا کہ جونہی ڈاکٹری معائنہ ختم ہو جائے گا وہ فوراً چلے آئیں گے۔ ڈاکٹر صاحبان ہز اکسلنسی کی صحت کو تشویش کی نگاہ سے دیکھتے ہیں اور ایسی صورت میں ظاہر ہے کہ وہ انھیں یہاں زیادہ دیر تک رہنے کی اجازت نہ دیں گے۔ یہی باعث ہے کہ اس طویل ڈاکٹری معائنہ کی ضرورت ہوئی

ڈورین :۔ اور کرنل تو ابھی تک کیوں نہیں آئے۔ انھیں تو یہاں وقت پر پہونچ جانا چاہئے تھا۔

گرانٹ :۔ (طنزیہ لہجہ میں) ۔ وہ برابر کے ایک کمرہ میں جھانسی کی رانی سے بات چیت کر رہے ہیں۔ جونہی وہ یہ خبر سنیں گے کہ گورنر جنرل ایوان کونسل میں آرہے ہیں، وہ بھی یہاں چلے آئیں گے۔

ڈورین و ہالیڈے :۔ (تعجب سے) ۔ جھانسی کی رانی!

ڈورین :۔ (تحکمانہ لہجہ میں) ۔ اور مسٹر گرانٹ! وہ یہاں کس کے حکم سے آئی!

ہالیڈے :۔ کیا ہز اکسلنسی نے حکم دیا تھا کہ آج وہ یہاں موجود رہے؟

گرانٹ :۔ حضرات! اس بارہ میں مجھ سے کچھ نہ دریافت کیجئے۔ کیونکہ آپ کی طرح مجھے بھی اس معاملہ سے کوئی آگاہی نہیں۔ میں اس معاملہ میں آپ کو صرف اس قدر بتا سکتا ہوں کہ جب اس جلسہ میں حاضر ہونے کے لئے میں اپنے دفتر سے چلنے لگا تو میرے پاس ایک رقعہ پہونچا جس میں لکھا تھا کہ جھانسی کی رانی کو آج یہاں لانے کی ذمہ داری کرنل تو اپنے سر لے رہے ہیں کہ شاید آخری فیصلہ کرنے سے بیشتر گورنر جنرل با کونسل جھانسی راج کے بارہ میں کوئی بات چیت کرنا چاہے۔ جب میں گورنمنٹ ہاؤس پہونچا تو معلوم ہوا کہ جھانسی کی رانی آچکی ہے اور برابر کے ایک کمرہ میں ٹھہرایا گیا۔ اس کے تھوڑی دیر بعد کرنل تو نے مجھ سے کہلا بھیجا کہ انھوں نے فوجی معتمد سے کہدیا ہے کہ وہ گورنر جنرل کی نقل و حرکت سے اطلاع دیتے رہیں تاکہ اُن کے آنے سے قبل وہ ایوان کونسل میں آجائیں گے۔

ہالیڈے :۔ (دونوں ہاتھوں سے اپنا سر پکڑ کر) اب تو معاملات بد سے بدتر ہوتے جارہے ہیں۔ اگر ہز اکسلنسی کو یہ معلوم ہو گیا کہ ان کے پیچھے لگانے کے لئے ایک عورت کو خفیہ طور پر گورنمنٹ ہاؤس میں لایا گیا ہے تو وہ کیا کہیں گے؟ (سر اٹھا کر اور بگڑ کر) ۔ سچ تو یہ ہے کہ یہ بے غیرت تو گردن مارے جانے کے قابل ہے، اچھا دیکھوں میں بھی کیا مزہ چکھاتا ہوں!

ہالیڈے :۔ (غصہ سے) ۔ ایسی گستاخی تو کبھی دیکھی نہ سُنی، کہتے ہیں کہ جب گیدڑ کی موت آتی ہے تو وہ شہر کی طرف بھاگتا ہے۔ بالکل یہی حال تو کا ہے، یقیناً اس کی قضا آئی ہے۔

عین اسی وقت کمرہ کے داہنی طرف ایک دروازہ کھلتا ہے اور کرنل جان تو مسکراتے ہوئے اور ہاتھ میں حقہ لئے داخل ہوتے ہیں اور ڈورین اور ہالیڈے کے پیچھے کھڑے ہو جاتے ہیں۔

بعد ازاں اپنی نشست کی طرف بڑھتے ہوئے۔

لو :۔ کیوں کیا معاملہ ہے!! آج تو تم لوگ بہت پھولے ہوئے سے نظر آتے ہو۔ صورتوں پر متانت کی پھٹکار برس رہی ہے ہونہہ! خدا کا شکر ہے کہ میرے اجداد میں بعض آئرلینڈ کے رہنے والے تھے۔ اور اسی لئے یہ بات مجھے معلوم ہے کہ جب امور سلطنت انجام دیتا ہوں تو ماتم زدہ بنکر نہ بیٹھنا چاہئے، ہندوستان کو ان لوگوں نے حاصل کیا ہے جو سخت سے سخت مصیبت کے وقت بھی ہنستے بولتے اور شگفتہ مزاج رہتے تھے۔ لیکن آج وہ زمانہ ہے کہ لوگ یہ خیال کرنے لگے کہ جب تک اعلیٰ حکام کوٹ پتلون سے سجے ہوئے نہ ہوں اور تحصیل کے خزانچیوں کی طرح روکھا منھ بنائے نہ رہیں اسوقت تک داد جہانبانی دی ہی نہیں جا سکتی۔

کرنل صاحب اپنی نشست تک پہونچتے ہیں۔ کرسی پر بیٹھ کر گردن سینہ پر جھکا لیتے ہیں۔ اور سامنے کی طرف ٹانگیں پھیلا کر خود بخود کچھ بکتے رہتے ہیں۔ دوسرے حاضرین ان کی طرف توجہ نہیں کرتے۔

لو :۔ (آپ ہی آپ) افوہ، کسقدر انقلاب ہو گیا ہے۔ جو صورت ڈورین نے آج بنا رکھی ہے اسے دیکھ کر کون کہہ سکتا ہے کہ یہ وہی شخص ہے جو آج سے بیس برس پہلے مادر زاد دریائے ہگلی میں کود پڑا تھا اور بارکپور سے کلکتہ تک تیرتا ہوا آیا تھا۔ جسے نہ ڈوبنے کا ڈر تھا نہ مگرمچھ کا خطرہ۔ اور یہ سب کچھ محض معمولی شرط کی وجہ سے کیا تھا۔ جب یہ شخص پرنسپ گھاٹ پر پہونچا تو لیڈیاں جمع تھیں، بینڈ بج رہا تھا اور یہ اپنی شرط کی رقم وصول کر رہا تھا۔ اور ذرا ان کا! مسٹر ہالیڈے کا حلیہ بھی تو ملاحظہ فرمائیے۔ یہ وہی ہیں جو جنرل گف کے ساتھ سکھوں سے لڑے، جن کی شجاعت و بسالت کی داستانیں مراسلات میں بیان ہوئیں، اور آج یہ ایسے مرزا پھویا بنے بیٹھے ہیں کہ انھیں گورنمنٹ ہاؤس میں آواز بلند کرتے بھی ڈر معلوم ہوتا ہے۔

ہالیڈے :۔ ہاں تو! سچ کہتے ہو۔

ہالیڈے بےچینی کے ساتھ ادھر ادھر دیکھ کر کچھ جواب دینا چاہتا ہے۔ لیکن کرنل تو اس کی پروا کئے بغیر اپنی گفتگو کا سلسلہ جاری رکھتا ہے۔

لو :۔ (سلسلۂ سخن جاری رکھتے ہوئے)۔ اور تو اور ذرا مسٹر گرانٹ کو دیکھئے جو بڑی آزادوراے والے سمجھے جاتے تھے!! یہ وہی ہیں جو الفنسٹن کے ماتحت تمام نوجوانوں میں سب سے زیادہ ہونہار تھے۔ یہ وہی ہیں جنھیں اس لئے کلکتہ لایا گیا تھا کہ یہ ہمیں حکومت چلانے کے طریقے سکھائیں گے۔ مگر اُف رے انقلاب، کس کو یقین آسکتا ہے کہ جو شخص بمبئی کے گورنر کا دست راست تھا آج وہ ہز اکسلنسی لارڈ ڈلہوزی کے دفتر کا صرف کلرک اور بوٹ صاف کرنیوالا

بن گیا ہے۔ ہائے ہائے!

ہالیڈے:۔ (غضبناک ہوکر)۔ سنئے جناب! میں آپ سے صاف صاف کہے دیتا ہوں کہ مجھے یہ مسخرہ پن پسند نہیں اور اگر آپ یہ سمجھتے ہوں کہ جھانسی کی رانی کو یہاں لاکر آپ نے آج جس چھچھورے پن کا اظہار کیا ہے اس پر آپ کے مسخرہ پن سے پردہ پڑ جائے گا تو آپ سخت غلطی پر ہیں۔ آنے دیجئے ہز اکسلنسی کو یہاں میں فوراً کہدوں گا کہ ایک عورت یہاں گورنمنٹ ہاؤس میں اس طرح لائی گئی ہے۔

لمحہ بھر سکوت۔ لو اپنے پاؤں سمیٹ لیتا ہے۔ اور ایک خاص شان کے ساتھ حقہ لئے ہوئے اٹھتا ہے۔ اور ہالیڈے کے سامنے پوری طرح اکڑ کر کھڑا ہوتا ہے اور تیز و تند نگاہوں سے دیکھتا ہوا کہتا ہے۔

لو:۔ سنو ہالیڈے! آج تک کسی شخص نے جان تو پر چھچھورے پن یا بزدلی کا الزام نہیں لگایا کہ اسے اس کا مزا نہ چکھا دیا گیا ہو۔ یا تو تم اپنے الفاظ فوراً واپس لو ورنہ کونسل کے بعد تمھیں اس کا خمیازہ بھگتنا پڑے گا۔

ڈوورین:۔ کرنل صاحب! یہ آپکی تمام اکڑفوں بیکار ہے، بات کرنا ہے تو آدمیت سے کیجئے، ہالیڈے یا اس کمرہ میں کوئی اور شخص آپ کی شجاعت اور دلیری پر حرف لانا نہیں چاہتا۔ لیکن آپ کی صحیح الدماغی پر قطعی ہم سب کو شک ہے۔

لو:۔ میری صحیح الدماغی کا امتحان تو بعد میں ہوتا رہیگا لیکن فی الحال معاملہ عزت و خودداری کا ہے اس لئے یا تو ہالیڈے صاحب اپنے الفاظ واپس لیں یا کونسل کے اجلاس کے بعد مقابلہ کے لئے تیار ہوں۔

ہالیڈے:۔ (جھکر)۔ کرنل صاحب اگر آپ کو ایسا ہی خیال ہے تو میں اپنے الفاظ واپس لیتا ہوں۔ آپ کا یہ خیال کر لینا کہ مجھے آپ کی شجاعت و بسالت میں شک ہے، یہ ظاہر کرتا ہے کہ آپ ابھی تک مجھ سے واقف نہیں۔ میں تو یہ چاہتا ہوں کہ آپ میں دلیری کا مادہ کسیقدر کم ہوتا تو بہتر تھا۔ گورنر جنرل کے علم یا اجازت کے بغیر رانی صاحبہ کو یہاں لانے سے پیشتر آپ کو اس معاملہ پر کافی غور کر لینا لازم تھا اور اب آپ نے ہماری جان نہایت سخت جھگڑے میں پھنسا دی ہے۔ آپ کی حماقت کے باعث ہم سب مصیبت میں مبتلا ہوں گے۔

لو:۔ (کھڑے ہوئے اور ہالیڈے کی طرف دیکھتے ہوئے)۔ ہالیڈے! ہم دونوں تقریباً تیس برس سے ایک دوسرے کو جانتے ہیں۔ اس عرصہ میں کیا آپ ایک واقعہ بھی ایسا بیان کر سکتے ہیں جس میں جان لو ——— نے اپنے فعل کی ذمہ داری کسی دوسرے کے سر رکھی ہو۔

عین اس وقت میز کے پیچھے کا دروازہ کھولکر گورنر جنرل کا فوجی سکریٹری داخل ہوتا ہے اور دروازہ کو ایک ہاتھ سے کھلا رکھ کر اعلان کرتا ہے کہ:۔ حضرات! نگاہ روبرو! ہز اکسلنسی گورنر

جنرل ایوان کونسل میں تشریف لا رہے ہیں۔ سنتے ہی ڈورین، ہالیڈے اور گرانٹ مودب استادہ ہوجاتے ہیں۔ اور جب لارڈ ڈلہوزی کمرہ میں داخل ہوتے ہیں توسب جھک کر بادب سلام کرتے ہیں۔ لاٹ صاحب میز کے اطراف میں ایک سرسری نگاہ ڈال کر اپنی بلند کرسی کے کے قریب پہونچکر پہلے سر جھکاتے ہیں بعد ازاں منھ اُٹھا کر فرماتے ہیں:۔ "میں اگز کٹو کونسل کے افتتاح کا حکم دیتا ہوں" یہ کہکر وہ اپنی کرسی پر متمکن ہوتے ہیں اور ان کے ساتھ ہی دیگر ارکان کونسل بھی بیٹھتے ہیں۔ لاٹ صاحب کے ہاتھ میں اب بھی حقہ موجود ہے اگرچہ کش بند ہیں اور سر جھکائے ہوئے کچھ سوچ رہے ہیں۔ گرانٹ کھڑے ہوکر بعض کاغذات لاٹ صاحب کے ملاحظہ سے گزارتا ہے۔

ڈلہوزی :۔ حضرات! آج ہمارے سامنے سب سے زیادہ اہم معاملہ جھانسی راج کا ہے۔ اگر آپ صاحبان پسند کریں توسب سے پہلے اسی معاملہ پر غور کر لیا جائے۔

(گرانٹ کے سوائے سب ممبر بہت اچھا! کہہ کر منظور کرتے ہیں)

ڈلہوزی :۔ معلوم ہوا ہے کہ یہ جھانسی والا معاملہ گزشتہ دسمبر میں بھی کونسل کے سامنے پیش ہوا تھا۔ اور چونکہ میں اسوقت برہما گیا ہوا تھا اس لئے اسوقت اس معاملہ میں کوئی کارروائی نہیں کی گئی تھی۔

ڈورین :۔ یور اکسلنسی! بالکل درست ہے۔ چونکہ یہ معاملہ گورنر جنرل کی خاص ذمہ داری کا ہے اس لئے ہم نے یہ معاملہ یور اکسلنسی کی واپسی تک ملتوی کر دیا تھا اور ہدایات جاری کر دی تھیں کہ بتبنیت کے معاملہ میں گورنمنٹ آف انڈیا کا ابھی کوئی فیصلہ نہیں ہوا ہے۔ (ڈلہوزی سنکر ڈورین کی طرف سر ہلاتا ہے)۔ مجھے یقین ہے کہ وہ احکام میجر مالکم کے پاس ارسال کر دئے گئے تھے اور ان کے مطابق عمل کیا گیا۔

(گرانٹ کی طرف متوجہ ہوکر) کیوں مسٹر گرانٹ یہی ہے نا؟

گرانٹ :۔ ہاں حضور اس معاملہ میں ابھی اسیقدر ہوا ہے۔ اگرچہ مقامی افسران متبنیٰ ولیعہد کی بتبنیت کے تسلیم کئے جانیکے موافق نظر آتے ہیں لیکن ہم نے ابھی اس بارہ میں کوئی آخری حکم نہیں دیا۔

ڈلہوزی :۔ (پہلے کاغذات اور پھر گرانٹ کی طرف دیکھکر)۔ اچھا تو مسٹر گرانٹ اس معاملہ کے متعلق تمام ضروری باتیں مختصراً بیان فرمائیے۔ مجھے اُمید ہے کہ آپ نے اس معاملہ کے متعلق تمام باتوں کا خلاصہ تیار کر لیا ہوگا۔

گرانٹ :۔ یقیناً مائی لارڈ! (ڈلہوزی سے کاغذات لیکر کھولتا ہے اور اس طرح بیان کرتا ہے) اس معاملہ کے متعلق تمام غور طلب اور ضروری اُمور یہ ہیں:۔ اول یہ کہ جھانسی راج ہمیشہ آزاد اور خود مختار رہا ہے۔ اور مرہٹوں کی حکومت کے زمانہ میں جو تعلقات جھانسی کے راجہ سے مرہٹوں کے تھے وہی اب ہمارے ہیں۔ چنانچہ اب اس بارہ میں کوئی سوال

باقی نہیں رہا کہ اگر متوفی راجہ کا کوئی براہ راست وارث نہ ہو تو اس کا فیصلہ کرنا کہ تخت و تاج کا آیندہ مالک کون ہوگا، طاقت بالادست کے اختیار میں ہے۔ مرہٹے اپنے اس اختیار پر ہمیشہ مُصر رہتے تھے، چنانچہ اب وہی حق و اختیار ان کے بجائے ہم کو حاصل ہے۔ اب اصلی سوال یہ نہیں ہے کہ ہم کو اختیار حاصل ہے یا نہیں بلکہ دیکھنا یہ ہے کہ اب تقاضائے مصلحت کیا ہے۔ اسی سلسلہ میں دوسرا نکتہ شروع ہو جاتا ہے۔ جو یہ ہے کہ اس سے قبل جھانسی کے تخت و تاج کی ملکیت پر دو مرتبہ جھگڑا ہو چکا ہے۔ اور دونوں مرتبہ جس راجہ کو ہم نے تسلیم کیا وہ کامیاب نہیں ہوا۔ آخری مرتبہ ہم نے یہ فیصلہ کیا تھا کہ حوالہ کرنے سے پہلے جھانسی راج پر چند سال تک اپنی نگرانی رکھی جائے۔ لیکن بعد کے واقعات سے ہماری یہ تولیت والی پالسی بھی ٹھیک نہ رہی اگرچہ اس وقت کا راجہ یعنی گنگا دھر راؤ اپنی رعایا میں بیشک ہر دلعزیز تھا۔ ان واقعات کا یاد رکھنا بھی ضروری ہے کہ جھانسی کی صوبہ داری کو جو بعد میں ریاست کے درجہ کو پہونچگئی ہم نے کیونکر تسلیم کیا۔ جھانسی راج سے ہمارا سب سے پہلا معاملہ اس وقت کے راجہ شیو راؤ بھاؤ کے اور ہمارے ذاتی تعلقات پر مبنی تھا۔ اور ان دونوں معاہدوں میں جو ہم نے شیو راؤ بھاؤ اور اس کے بیٹے رامچندر راؤ سے کئے ہیں انھیں ذاتی تعلقات پر زور دیا گیا ہے۔ اب موجودہ صورت حال یہ ہے کہ شیو راؤ بھاؤ اور رامچندر راؤ کی نسل کا براہ راست وارث تخت و تاج راجہ گنگا دھر راؤ کا انتقال ہو گیا ہے۔ اور اب ان راجاؤں کی نسل کا جن سے ذاتی تعلقات کی بنا پر پچاس سال سے جھانسی راج پر ہماری بیاورت قائم ہے۔ کوئی براہ راست دعویدار نہیں رہا۔ اور یہ متبنّیٰ لڑکا انند کمار جس کے لئے رانی لکشمی بائی نے بہت زور شور کے ساتھ دعویٰ پیش کیا ہے، آنجہانی راجہ سے دور کے رشتہ کا تعلق رکھتا ہے۔

(گرانٹ مزید معلومات کے لئے اپنے کاغذات دیکھنے لگتا ہے۔ اور ڈورین جو موقعہ کی تاک میں تھا کہتا ہے)

ڈورین:۔ اس معاملہ کے متعلق جہاں تک مجھے یاد ہے وہ یہ ہے کہ جب کبھی اس ریاست کا نظم و نسق راجہ کے ہاتھ میں رہا آمدنی گھٹتی چلی گئی اور جس زمانہ میں ریاست کا انتظام ہمارے ہاتھوں میں آیا تو آمدنی بڑھ گئی اور ریاست کی مالی حالت ترقی کر گئی۔ کیوں ہے نا مسٹر گرانٹ؟

گرانٹ:۔ ہاں عام طور پر تو یہی کہا جا سکتا ہے۔

لو:۔ (جلدی دخل دیکر) لیکن آمدنی کی ترقی کس طرح ہوئی۔ اسی طرح نا کہ ریاست کے سر استمراری بندوبست منڈھ دیا گیا اور جو خانہ خراب کسان رقوم واجب الادا نہ داخل کر سکے انھیں جیل میں ٹھونس دیا گیا۔

ڈلہوزی:۔ آرڈر! آرڈر!! کرنل صاحب آرڈر!!! از راہ مہربانی اپنے الفاظ وہیں تک محدود رکھئے جہاں تک مسئلہ زیر بحث کا تعلق ہے۔ (گرانٹ سے) آنجہانی راجہ کو عنان حکومت سپرد کرنے سے پہلے ہم نے ریاست کا

انتظام کتنے عرصہ تک کیا تھا؟

گرانٹ :۔ مائی لارڈ! تقریباً چھ سال تک۔ اور اس دوران میں ریاست کی آمدنی بہت کچھ بڑھ گئی تھی اور تمام نظم ونسق کی حالت بہت اچھی ہو گئی تھی۔

ڈلہوزی :۔ متوفی راجہ کے عہد کی ابتدا رہی میں ایسے کیا وجوہ پیش آئے کہ ریاست کا انتظام ہم نے اپنے ہاتھ میں رہنے دیا تھا؟

گرانٹ :۔ مائی لارڈ! راجہ گنگا دھر راؤ کے باقاعدہ راجہ تسلیم کئے جانے سے بیشتر ریاست کا انتظام ہمارے ہاتھوں میں تھا۔ کیونکہ سابق راجہ کی وفات کے بعد وراثت کا جھگڑا اٹھ کھڑا ہوا تھا۔ ایسی حالت میں یہ قدرتی امر تھا کہ ہم اس بات کا اطمینان کر لیتے کہ ہونے والا راجہ ریاست کے قابل بھی ہے یا نہیں، خصوصاً ایسی صورت میں جبکہ متوفی راجہ کے زمانہ میں ریاست کی حالت بہت خراب ہو گئی تھی۔ تفتیش وتحقیق کے بعد معلوم ہوا کہ راجہ گنگا دھر راؤ ایک کمزور عقل و دماغ کا آدمی ہے، اس لئے فیصلہ کیا گیا کہ جب تک اس امر کا اطمینان نہ ہو جائے کہ حوالگی راج کے بعد ریاست کا انتظام خراب نہیں ہوگا، ریاست کا نظم ونسق اپنے ہی ہاتھ میں رکھا جائے۔ مگر ۱۸۴۲ء میں ہم اس نتیجہ تک پہونچے کہ اگر ریاست کی حکومت راجہ کے ہاتھ میں دیدی جائے تو کوئی نقصان نہ ہوگا۔

لو :۔ (گرانٹ سے) اور غالباً یہ بھی تو صحیح ہے کہ گنگا دھر راؤ کو ریاست دینے سے پہلے ہم نے ریاست کا ایک وسیع اور زرخیز علاقہ اس بہانہ سے غصب کر لیا تھا کہ یہ علاقہ ان سدمات کا معاوضہ ہے جو ہم بندیلکھنڈ رجمنٹ پر کرتے ہیں؟

ہالیڈے :۔ بندیلکھنڈ کی فوج اسی غرض سے وجود میں لائی گئی تھی کہ جھانسی جیسی ریاستوں کا تحفظ کیا جائے۔

لو :۔ (راجک کر دوسروں کی طرف دیکھتا ہے)۔ بالکل صحیح! میں اس پر اعتراض نہیں کرتا کہ جو رجواڑے اس فوج سے فایدہ اُٹھاتے ہیں ان سے معاوضہ لینے کا ہم کو حق حاصل ہے۔ لیکن کیا تمام رجواڑے اور نواب یہ دریافت کر سکتے ہیں کہ جو خدمات جلیلہ اس فوج نے انجام دی ہیں ان کا بدل بصورت نقد کس نے مقرر کیا ہے؟ کیا متوفی راجہ جھانسی سے بھی، جس کی نسبت یہ کہا جاتا ہے کہ وہ ایک ضعیف عقل وفہم کا آدمی تھا تعین معاوضہ کے بارہ میں مشورہ لیا گیا تھا؟ علاوہ ازیں جو علاقہ فوجی خدمات کے عوض ہم کو حوالہ کیا جانے والا تھا کیا اسکا انتخاب خود راجہ گنگا دھر راؤ نے کیا تھا؟

ڈلہوزی :۔ آرڈر! آرڈر!! کرنل لو آرڈر!!! آپ کے بیشتر واور ان کے رفقاء کار جو کچھ کر گئے ہیں اس پر نکتہ چینی کرنے میں آپ اپنی حد سے تجاوز کر رہے ہیں۔ جو مسئلہ اس وقت ہمارے زیر غور ہے اُس سے ان باتوں کا کوئی تعلق نہیں۔ اور میں اس قسم کے سوال اُٹھانے کی ہرگز اجازت نہیں دوں گا۔

لو :۔ (جوش میں آکر کھڑا ہو جاتا ہے)۔ مائی لارڈ! میں التجا کرتا ہوں کہ میرے یہ الفاظ ضبط تحریر میں لائے جائیں

کہ بعض ہندوستانی والیان ریاست کے معاملہ میں میں اپنے پیشرووں کے عمل پر کوئی اعتراض نہیں کرتا۔ لیکن یہ ممکن ہے کہ جس زمانہ کی نسبت یور ایکسلنسی نے گیا گزرا زمانہ ارشاد فرمایا ہے وہ پھر واپس آکر ہم کو پریشان کرنے لگے۔

ڈلہوزی:۔ (سختی سے)۔ کرنل صاحب! یہ آپ کس طرف اشارہ کر رہے ہیں؟

لو:۔ (آہستہ اور سنجیدگی سے)۔ مائی لارڈ! میرا مقصد یہ ہے کہ دیسی رجواڑوں کا جسقدر اعتماد ہم کو حاصل ہوگا، اُسیقدر مضبوطی سے ہم اپنے علاقہ پر قابض رہیں گے۔

(ڈلہوزی اپنی کرسی سے اُٹھ کر ادھر اُدھر بیقراری کے ساتھ ٹہلنے لگتا ہے۔ اور تھوڑی دیر بعد دفعتہً کرنل لو کے پاس رک کر تیز الفاظ میں خطاب کرتا ہے)

ڈلہوزی:۔ کرنل لو میں آپ کے خیالات وجذبات کو قدر کی نگاہ سے دیکھتا ہوں۔ لیکن آپ کی زمانہ شناسی پر آپ کو مبارکباد نہیں دے سکتا۔ کیا آپ یہ نہیں دیکھتے کہ ہمارے ارادے خواہ کچھ ہوں لیکن اس ملک میں ہماری موجودگی سے نئی نئی قوتیں وجود میں آرہی ہیں؟ ہمارے اغراض ومقاصد خواہ کچھ ہوں لیکن ہم ملک میں نئے نئے معیار قائم کرنے پر مجبور ہیں۔ دولت مغلیہ کو محض اسی وجہ سے زوال ہوا کہ وہ اقتضاء زمانہ کو پورا نہ کرسکی۔ مغل فرمانرواؤں میں یہ قابلیت نہیں تھی کہ وہ دورِ جدید کے بدلے ہوئے رنگ ڈھنگ اور بڑھتی ہوئی ضروریات کو دیکھ کر ویسا ہی طریقہ خود بھی اختیار کریں۔ کرنل صاحب ہم اسی وقت کامیاب ہوسکتے ہیں جب ماضی کا خیال کم اور مستقبل کی فکر زیادہ کریں۔ (کرنل کی کرسی کے قریب آکر) یہ چھوٹی چھوٹی دیسی ریاستیں جن کے آپ اسقدر دلدادہ ہیں، یہ کیا ہیں؟ یہ سب بدانتظامی اور خودغرضی کے مرکز ہیں۔ (اپنی کرسی پر بیٹھ کر) زمانہ چلا چلا کر حسن نظام، باقاعدگی، اشتراک عمل، تعلیم، مستعدی اور عمدہ ذرائع نقل وحمل کا تقاضا کر رہا ہے، اور تا وقتیکہ ہم ایک ترقی پذیر حکومت کے یہ عناصر اس ملک میں پیدا نہ کردیں گے، ہماری حکومت بھی اس ملک میں اتنی ہی مختصر ہوگی جتنی کہ مغلوں کی ہوئی۔ میرا مطمح نظر ہمیشہ رعایا کی فلاح وبہبود رہے گا۔ خواہ اس میں مجھے کامیابی ہو یا شکست۔ (سامنے رکھے ہوئے کاغذات کی طرف دیکھ کر) اچھا اب کام کا سلسلہ جاری ہونا چاہئے۔

ڈورین:۔ یور ایکسلنسی، میں نے جہاں تک اس معاملہ پر غور کیا ہے۔ میرے نزدیک وہی طریقہ مناسب معلوم ہوتا ہے جو مجلس ڈائرکٹران نے ریاست ستارہ کے متعلق قائم کیا ہے اور جس پر ہم حال ہی میں ناگپور کے بھونسلا خاندان کے متعلق عمل کرچکے ہیں۔ ہمیں جھانسی راج کا الحاق کرلینا چاہئے۔ اور ایسا کرنے کا ہمیں کامل حق ہے۔ رانی کو ایک معقول پنشن دیدی جائے تاکہ وہ اس کے ذریعہ سے اپنی تمام جائز ضروریات اور خواہشات پوری کرسکے۔

ڈلہوزی :۔ آپ کا شکریہ مسٹر ڈورین! آپ کی رائے میری رائے سے بالکل متفق ہے۔ (پہلے ہالیڈے پھر لو کی طرف دیکھ کر) کیا کونسل کے دیگر ممبر صاحبان بھی اس معاملہ میں کچھ کہنا چاہتے ہیں؟

ہالیڈے :۔ میں مسٹر ڈورین اور یور ایکسلنسی کی رائے سے قطعی متفق ہوں۔

(سب کے سب کرنل لو کی طرف دیکھتے ہیں جو کسی خیال میں محو ہے)

ڈلہوزی :۔ اچھا تو کرنل صاحب اگر آپ کچھ نہیں فرمائینگے تو میں یہ سمجھ لوں گا کہ آپ بھی ہم لوگوں سے متفق الرائے ہیں اس صورت میں مجھے صرف یہ کرنا ہے کہ اپنا یہ متفقہ فیصلہ ضبط تحریر میں لے آؤں کہ جھانسی راج کا الحاق کیا ہونا چاہئے۔ بعد ازاں میں اس کے متعلق پورے وجوہ قلمبند کر کے ڈائرکٹروں کی خدمت میں ایک سفارشنامہ ارسال کر دوں گا۔ اور بھیجے جانے سے قبل اس سفارشنامہ کا مسودہ مسٹر گرانٹ آپ لوگوں کے معائنہ کے لئے بھیجدیں گے۔

لو :۔ (ڈلہوزی کی طرف دیکھ کر) یور ایکسلنسی نے رعایا کی فلاح و بہبود کی نسبت جو کچھ فرمایا تھا میں اس وقت اسی پر غور کر رہا تھا۔ اور اسوقت میرے دل میں یہ خیال آیا کہ کیا یہ مناسب نہ ہوگا کہ الحاق جھانسی سے قبل ریاست کی رعایا سے استصواب کر لیا جائے کہ وہ ہمارے ماتحت رہنا زیادہ پسند کریں گے یا رانی اور اس کے متبنیٰ بیٹے کے ماتحت۔

ڈلہوزی :۔ (غضبناک ہو کر کرسی سے کھڑا ہو جاتا ہے) کرنل لو میں آپ سے آخری مرتبہ کہنا چاہتا ہوں کہ اس قسم کی مداخلت سے باز آئیے، ورنہ مجھے اپنا یہ تکلیف دہ فرض ادا کرنا پڑے گا کہ میں آپ کی شکایت ڈائرکٹروں سے کر دوں۔

لو :۔ (آہستہ اٹھکر آداب بجالاتا ہے) اگر یور ایکسلنسی کا مقصد یہ ہے کہ کونسل کی ممبری سے میرا استعفا طلب کیا جائے گا تو میں یہ نہیں چاہتا کہ یور لارڈشپ اسقدر زحمت گوارا فرمائیں۔ یہ دیکھئے یہ میرے کاغذات تیار ہیں (کوٹ کے اندر سینہ کی جیب سے سربمہر لفافہ نکال کر ڈلہوزی کو دکھاتا ہے) اور میں یہ کاغذات ہز ایکسلنسی کے حوالہ کرنے کو طیار رہوں مگر ایک شرط سے۔

ڈلہوزی :۔ (حیران ہو کر کبھی لو کی طرف دیکھتا ہے کبھی دوسروں کی طرف) کرنل صاحب میں آپ کا مطلب نہیں سمجھا۔

لو :۔ (اپنی کرسی سے ہٹ کر اور گرانٹ کے پیچھے آکر) یور ایکسلنسی کو معلوم ہونا چاہئے کہ میں نے اپنی عمر عزیز کے چالیس برس ہندوستان پر قربان کئے ہیں اور اگر وہ لوگ جن کے ہاتھوں میں اسوقت ہندوستان کی عنانِ حکومت ہے، یہ سمجھتے ہیں کہ اب میں بیکار اور دقیانوسی ہو گیا ہوں تو میں مردانہ وار ملازمت سے دستبردار ہونے پر

آمادہ ہوں۔ بہرحال اگر یور ایکسلنسی چاہتے ہیں کہ اب میں چلا جاؤں تو میں یور لارڈشپ سے درخواست کرتا ہوں کہ مجھے اس طرح جانے کی اجازت دی جائے جو میری عزت کے شایان شان ہو۔ اور یہی وجہ ہے کہ میں شرط پیش کرتا ہوں۔

(لمحہ بھر سکوت طاری ہو جاتا ہے۔ سب لو کی طرف دیکھنے لگتے ہیں اور لو ڈلہوزی کے اشارہ کا منتظر ہے۔ ڈلہوزی ہٹکر ایک کھڑکی کے پاس پہونچکر باہر کی طرف جھانکنے لگتا ہے۔ لو اس کے پیچھے جاتا ہے۔ اور پہلے آہستہ پھر تیزی سے گفتگو کرتا ہے)

لو:۔ یور ایکسلنسی! کل شام میرے پاس ایک نوجوان افسر آیا جس کے والدین میرے بڑے عزیز دوست تھے۔ یہ نوجوان پولیٹکل ڈیپارٹمنٹ میں ہے۔ میں نے ہی اس کو تربیت دی ہے۔ اور اس کے کاموں کو فخر کے ساتھ دیکھتا رہا ہوں۔ یہ نوجوان افسر میجر ایلیس ہے جو بندیلکھنڈ میں تعینات ہے اور معاملات جھانسی کا انچارج ہے وہ اپنی ملازمت کو خطرہ میں ڈالکر کلکتہ آیا ہے تاکہ مجھ سے سفارش کرے کہ جس طرح ممکن ہو جھانسی راج رانی اور متبنٰی راجکمار کے حوالہ کر دیا جائے اور چونکہ رانی اور متبنٰی لڑکا پہلے سے کلکتہ میں ہیں اس لئے وہ انھیں کل رات مجھ سے ملانے لایا۔ اس نوجوان افسر کا خیال ہے کہ اگر ہم نے کمار کی تبنیت تسلیم کرنے سے انکار کر دیا اور جھانسی راج کا الحاق کر لیا تو بہت سخت غلطی ہوگی۔ وہ اس بات کا پختہ ثبوت پیش کرتا ہے کہ شیو راؤ بھاؤ کے زمانہ سے آج تک جھانسی کے تمام راجہ ہمارے وفادار رہے ہیں۔ علاوہ ازیں وہ قریب کی ایک ریاست اورچھا کی نظیر بھی پیش کرتا ہے جہاں کے متبنٰی ولیعہد کو ہم نے چند سال ہوئے ایسے ہی حالات میں تسلیم کیا ہے جیسے کہ اسوقت جھانسی میں رونما ہوئے ہیں۔ میں یور ایکسلنسی سے بیان نہیں کر سکتا کہ میجر ایلیس کی پرزور اپیل کا میرے دل پر کس قدر اثر ہوا ہے اور چلتے وقت جب وہ اپنی ڈیوٹی پر جانے لگا تو اس نے ایسے الفاظ کہے کہ اب تک کانوں میں گونج رہے ہیں۔ اس نے کہا کہ:۔ "اگر تبنیت کے معاملہ میں ہم نے وفادار راجاؤں کے حیات مذہبی کو پامال کر کے ان کا اعتبار کھو دیا تو ایسا سخت طوفان برپا ہوگا کہ اس سے نجات مشکل ہوگی۔

ڈلہوزی:۔ (کسی قدر متوجہ ہوکر گو پشت پھیرے ہوئے)۔ آپ کی خاص درخواست کیا ہے۔ کرنل صاحب!

لو:۔ (اور قریب بڑھ کر) یور ایکسلنسی! میں یہ چاہتا ہوں کہ تبنیت کے معاملہ میں حضور کا فیصلہ جو کچھ ہو لیکن کم ازکم ایک مرتبہ رانی سے مل لیجئے، تاکہ اس کو کم ازکم یہ اطمینان تو ہو جائے کہ جو مصیبت اس پر نازل ہونے والی ہے اس کے رفع کرنے میں وہ ہر ممکن کوشش کر چکی۔ نہیں رانی کو اس بات کا بھی موقعہ دینا چاہئے کہ وہ ہندوستان کے سب سے بڑے حاکم کی زبان سے یہ سُن لے کہ جو فیصلہ ہم نے جھانسی راج کے بارہ میں کیا ہے وہ رموز مملکت پر مبنی ہے خواہ وہ رانی کے خلاف ہی ہو۔ علاوہ ازیں وہ یہ بھی جان لیگی کہ ہم معمولی چور اور ڈاکو نہیں ہیں جیسا کہ ہمارے کاموں کی وجہ سے

بعض لوگ ہم کو سمجھتے ہیں۔

ڈلہوزی :۔ (گھوم کر) اچھا، میں رانی سے ملاقات کروں گا۔ اس لئے نہیں کہ میں اس کی باتوں سے متاثر ہوں، بلکہ اس لئے کہ اس ناگوار معاملہ کی تہ میں جو ہمارے اغراض و مقاصد ہیں وہ اسے سمجھا دئے جائیں۔ (میز کی طرف چلکر) مسٹر گرانٹ! آپ فوجی سکریٹری کو حکم دیدیجئے کہ وہ بہت جلد انتظام کر کے جھانسی کی رانی کو ملاقات کے لئے مدعو کریں آج کی کونسل کا کام ملاقات تک ملتوی رہیگا۔ تاکہ جو کچھ گفتگو رانی سے ہو وہ کونسل میں بیان کردوں۔ اچھا تو ہم الحاق کے بارہ میں متفق ہیں نا؟

(ڈورین اور ہالیڈے سر کے اشارہ سے "ہاں" کرتے ہیں۔ لیکن کرنل تو آگے بڑھ کر ڈلہوزی کے پاس آتا ہے)

لو :۔ یور اکسلنسی! جھانسی کی رانی یہیں برابر کے ایک کمرہ میں موجود ہے۔ اگر زحمت نہ ہو تو ابھی ملاقات فرمالیجئے۔

ڈلہوزی :۔ (کاغذات سے آنکھ اٹھا کر) کیا یہیں کسی کمرہ میں انتظار کررہی ہے؟

(سکوت طاری ہوتا ہے۔ پہلے گرانٹ، پھر ڈورین اور پھر کرنل لو کی طرف دیکھتا ہے جو اپنا سر جھکا لیتا ہے)

ڈلہوزی :۔ (کرسی سے اٹھ کر غصہ میں لو کی طرف آکر)۔ کرنل لو! اگر اس بیہودگی اور توہین کے ذمہ دار آپ ہیں تو میں آپ کا سر توڑنے میں ہرگز رحم و کرم سے کام نہیں لوں گا۔

لو :۔ (سربمہر لفافہ جیب سے نکال کر ڈلہوزی کو دیکر)۔ لاٹ صاحب! میرا سر پہلے ہی ٹوٹ چکا ہے۔ نہ صرف سر بلکہ اس کے ساتھ دل بھی!

(ڈلہوزی ہاتھ بڑھا کر لفافہ جھٹک لیتا ہے۔ اور کھڑکی کے پاس جاکر غصہ کو ضبط کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ اسی اثناء میں ڈورین اور ہالیڈے اٹھ کر لو کے پاس جاتے ہیں۔ ڈورین محبت سے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں تھام لیتا ہے اور ہالیڈے گلے میں باہیں ڈال دیتا ہے۔

تھوڑی دیر بعد ڈلہوزی گھوم کر میز کی طرف آتا ہے اور لفافہ کو چاک کرتا ہے)

ڈلہوزی :۔ (گرانٹ سے) مسٹر گرانٹ! اجلاس ملتوی۔ رانی کو طلب کرو۔

(ڈلہوزی کے الفاظ سنکر کرنل لو ہالیڈے کے شانہ پر گردن جھکا دیتا ہے)

پردہ گرتا ہے

ایکٹ دوسرا۔ منظر دوسرا

(پانچ منٹ بعد وہی کمرہ وہی سین۔ لارڈ ڈلہوزی، جھانسی کی رانی، کمار انند راؤ اور مسٹر گرانٹ موجود ہیں۔ ڈلہوزی کے دونوں ہاتھ انند راؤ کے شانوں پر رکھے ہیں۔ اور وہ شفقت آمیز نگاہوں سے لڑکے کو دیکھ رہا ہے۔ رانی مسز گرانٹ کی کرسی پر بیٹھی ہے۔ چہرہ پر ہلکے آب وال کا لمبا نقاب ہے۔ رانی اگرچہ ہنوز لباس بیوگی پہنے ہوئے ہے لیکن اوپر سیاہ زر دوز شال اور پاؤں میں دلی کی کامدار جوتی پہنے ہے۔ انند راؤ ہندو شہزادوں جیسا لباس پہنے ہے اور اسکے پہلو میں ایک چھوٹی سی تلوار لٹکتی ہے۔ گرانٹ کاغذات دیکھ رہا ہے)

ڈلہوزی :۔ (شفقت آمیز لہجہ میں انند راؤ سے) اچھا تو تم شمشیر زنی اور شہسواری سیکھ رہے ہو؟

(انند راؤ سر ہلا کر ہاں کرتا ہے)

ڈلہوزی :۔ (مسکرا کر) اچھا دکھاؤ تم تلوار کیونکر چلاتے ہو۔

(انند راؤ پیچھے ہٹکر تلوار کھینچتا ہے اور چند ہاتھ دکھاتا ہے)

ڈلہوزی :۔ (مسکراتے ہوئے) خوب! خوب!! اچھا اب دیکھیں تم نے لکھنے پڑھنے میں کہاں تک ترقی کی ہے۔

(انند راؤ اپنی تلوار نیام میں ڈال لیتا ہے۔ اور خاموش ہوکر رانی کی طرف دیکھتا ہے)

رانی :۔ مائی لارڈ! یہ بعد میں ہوتا رہیگا۔ جس شخص کو راجہ بننے کی توقع ہو اسے چاہئے کہ پہلے وہ کام سیکھے جو راجاؤں کا خاص شغل ہے۔ لکھنے پڑھنے کے کام کے لئے تو وہ منشی بھی نوکر رکھ سکتا ہے۔ لیکن جب تک وہ فن جنگ سے واقف نہ ہوگا۔ وہ اپنے تخت و تاج کی کیونکر حفاظت کرسکیگا۔

ڈلہوزی :۔ رانی صاحبہ! آپ کو معلوم نہیں میرے بزرگوں کا بھی یہی عقیدہ تھا۔ اور ابھی کوئی سو برس کی ہی بات ہے کہ میرا خاندان ایک چھوٹی سی ریاست کے حکمراں تھے، اور ہندوستان کے راجاؤں کی طرح، سوائے اپنے بادشاہ یعنی شاہ اسکاٹلینڈ اور کسی کے سامنے سر نہ جھکاتے تھے، اور وہ انگریزوں کے ساتھ لڑا کرتے تھے۔

(رانی حیران ہوجاتی ہے)

رانی :۔ تو کیا آپ انگریز نہیں ہیں؟

ڈلہوزی :۔ نہیں رانی صاحبہ! میں انگریزوں کے بادشاہ کا ملازم ہوں جو اتفاق سے میرے وطن اسکاٹلینڈ کا بھی بادشاہ ہے۔ جس طرح آپ کے مرہٹہ بزرگ کہ ہرچند وہ رنگ مغلوں جیسا رکھتے تھے اور ان کو بعض اوقات اپنا بادشاہ

تسلیم بھی کرتے تھے اگروہ مسلمان نہیں تھے، اسی طرح اگرچہ میرا رنگ انگریزوں جیسا ہے اور میں انگریزی جھنڈے کو سلام بھی کرتا ہوں، لیکن میں نسل کے لحاظ سے انگریز نہیں ہوں۔

رانی :۔ (گرانٹ کی طرف دیکھ کر آہستہ سے) - اور یہ صاحب! کیا یہ انگریز ہیں ؟

ڈلہوزی :۔ نہیں وہ بھی میری طرح اسکاٹ ہیں۔ بات یہ ہے کہ جب ہم لوگوں نے یہ سمجھ لیا کہ انگریزوں کے بادشاہ کے ساتھ لڑنے سے یہ زیادہ بہتر ہوگا کہ ہم اس کا کام کریں، تو ہم لوگوں نے انگریزی جھنڈے کے نیچے ملازمت اختیار کرلی۔ تاکہ زیادہ سے زیادہ فائدہ اُٹھائیں۔ اور اب اسکاٹلینڈ والے ہر جگہ جہاں جہاں انگریزی راج ہے بڑے بڑے ذمہ دار عہدوں پر مامور ہیں، فوج میں وہ ہیں، مال میں وہ ہیں، سول میں وہ ہیں، الغرض وکیل بھی ہیں، ڈاکٹر بھی ہیں، پادری بھی ہیں اور تاجر بھی۔

رانی :۔ (گھبرا کر) - کیا کرنل تو صاحب بھی اسی نسل سے ہیں جس کے آپ اور یہ صاحب ہیں ؟

ڈلہوزی :۔ نہیں نہیں رانی صاحبہ! جہاں تک میرا خیال ہے کرنل تو کے آبا و اجداد انگلستان میں ایک اور ملک سے آئے تھے جو ہے تو انگلستان کے قریب ہی مگر اس سے اور میرے ملک سے بالکل مختلف ہے اس کے ملک کا نام آئرلینڈ ہے۔ اور وہاں کے باشندے ابھی تک انگریزوں کے دوست نہیں ہیں۔ اگرچہ ان میں سے بہت سے انگریز بادشاہ کے اسی طرح ملازم ہیں، جیسے کہ ہم یعنی اسکاٹلینڈ والے۔

رانی :۔ (مضطرب ہو کر کھڑی ہو جاتی ہے) - تو اے لارڈ! آپ اور تو صاحب بھی گویا ویسے ہی ہیں جیسے راجہ جے سنگھ اور دیگر ہندو راجہ تھے، جو مغل بادشاہوں کے ملازم ہو کر اپنے بھائی ہندو راجاؤں سے لڑتے تھے۔

ڈلہوزی :۔ (آہستہ سے اُٹھ کر کھڑکی کے پاس جاتا ہے اور چوکھٹے کے سہارے سے لگ کر کہتا ہے) - رانی صاحبہ! اگر آپ اطمینان سے سننا چاہتی ہیں تو میں اپنے خاندان کے تاریخی واقعات سے آپ کو ایک قصہ سناتا ہوں (رانی کو بیٹھ جانے کا اشارہ کرتا ہے) - رانی صاحبہ! جیسا کہ میں آپ سے عرض کر چکا ہوں میرے آبا و اجداد انگریزوں کے خلاف لڑ کر اپنی طاقتیں صرف کیا کرتے تھے۔ ہمارے خاندان کی جائداد اس دشوار گزار اور ناہموار علاقہ میں واقع ہے جو انگلستان اور اسکاٹلینڈ کے درمیان حد فاصل ہے۔ ایک مرتبہ ایک زبردست انگریزی فوج نے اسکاٹلینڈ پر حملہ کیا اس وقت میرے بزرگوں میں سے ایک جو انگریزوں سے بھاگ کر مع اپنے آدمیوں کے غاروں میں جا چھپے تھے، ایسی حالت میں جبکہ انگریز تیار نہ تھے تلواریں سونت کر ان پر آپڑے اور ایک مشہور قلعہ فتح کر لیا۔ اسکاٹلینڈ کے بادشاہ نے خوش ہو کر انھیں مفتوحہ قلعہ کا قلعدار بنا دیا اور گرد و نواح کا علاقہ بھی انھیں کے ماتحت کر دیا۔ بدقسمتی سے اسی قلعہ کو اسکاٹلینڈ کا ایک اور خاندان ہمیشہ للچائی ہوئی نظروں سے دیکھا کرتا تھا۔ جب اس قلعہ کا حاکم میرے بزرگ کو

بنا دیا گیا تو یہ طاقتور قبیلہ بہت ناراض ہوا۔ اور زیادہ عرصہ نہ گزرنے پایا تھا کہ ان لوگوں نے اجتماع کرکے قلعہ کو گھیر لیا۔ اور کچھ دنوں کے محاصرہ کے بعد فتح کرکے قلعدار کو قید کرلیا۔ وہ بیچارے فاقوں کے مارے قید ہی میں مر گئے۔ (رانی کی طرف بڑھکر) رانی صاحب! اس قصہ کا ماحصل یہ ہے کہ انسان کو دوست سے بھی اتنا ہی نقصان پہونچ سکتا ہے جتنا کہ دشمنوں سے۔ اور جن لوگوں کا پیشہ ہی لڑنا ہوتا ہے ان کے نزدیک دشمن و دوست سب برابر ہیں۔ انھیں لڑنے سے غرض ہوتی ہے

(یہ کہکر کرسی کی ٹیک لگا لیتا ہے)

رانی :۔ (اچک کر بیٹھ جاتی ہے)۔ لارڈ ڈلہوزی! اگر آپ اپنی عزیز چیزوں کو محفوظ رکھنا چاہتے ہیں تو آپ کو لڑنا پڑیگا کیا آپ کے بزرگوں نے اپنی زمین واپس لینے کے لئے جنگ نہیں کی تھی؟

ڈلہوزی :۔ (مسکراتے ہوئے)۔ ہاں رانی صاحبہ! انھوں نے ضرور جنگ کی تھی، مگر بعد میں انھوں نے مع دیگر امراء و فرمانروایان اسکاٹلینڈ کے اپنی آزادی کھودی اور محض برائے نام زمیندار رہ گئے۔ یعنی دوسروں کی طرح بادشاہ کی رعایا بن گئے۔ اور سوائے اس کے کہ اپنی ذاتی قابلیتوں اور خاندانی روایتوں پر فخر کریں ان کے لئے اور کوئی شرف نہیں ہا۔

رانی :۔ (ڈلہوزی کے قریب جاکر)۔ مائی لارڈ! آپ یہ نہ سمجھیں کہ جھانسی کے فرمانروا محض زمیندار ہوکر رہ جائینگے ہمارا شرف اور ہماری خودداری اس کی ہرگز اجازت نہ دے گی۔

ڈلہوزی :۔ (سیدھے ہوکر اور شاندار لہجہ میں)۔ رانی صاحب! میں آپ کی اس دلیری کی داد دیتا ہوں کہ آپ آج مجھ سے ملنے تنہا تشریف لائیں اور جو کچھ باتیں کیں وہ صاف گوئی سے کیں۔ لیکن میں یہ ماننے کے لئے ہرگز تیار نہیں کہ ایک ڈلہوزی کی عزت اور خودداری کسی طرح سے جھانسی کے راجہ سے کم ہے۔ میرے بزرگ صرف چند سو ایکڑ پر حکومت کرتے تھے اور وہ بجا طور پر اپنی آزادی و خودمختاری پر فخر کرتے تھے۔ اور میں ان کی اولاد ملک ہندپر حکومت کرتا ہوں جو انگلستان اور اسکاٹلینڈ دونوں کو ملاکر بارہ گنا وسیع ہے ———— اور اس لئے زیادہ فخر و شرف رکھتا ہوں۔ بایں ہمہ میں اس میں زیادہ عزت سمجھتا ہوں کہ اپنے بادشاہ کی خدمت کروں اور اسکی وفادار رعیت رہوں۔

رانی :۔ (اپنی جگہ پر سر نہوڑا کر بیٹھ جاتی ہے اور مایوسانہ لہجہ میں کہتی ہے)۔ مائی لارڈ! جو کچھ آپ فرماتے ہیں یہ ممکن ہے کہ گوری قوموں کے لئے صحیح ہو لیکن جھانسی میں انند کمار کو اس سے کوئی فائدہ نہیں پہونچتا۔ اگر ریاست کا الحاق کرلیا گیا تو اس غریب کا کیا حشر ہوگا۔ وہ فرمانروایان جھانسی کی شان کو کیونکر قائم رکھیگا۔ اور وہ رسمیں کیونکر ادا کریگا جو ہمارے رواج کے موافق ایک فرزند رشید کے لئے لازم ہیں؟

ڈلہوزی :۔ (بشیر کر انند کمار سے)۔ یہاں آیئے کمار صاحب!

(انند کمار، جو ڈلہوزی اور رانی کی گفتگو کے دوران میں رانی کے قدموں میں فرش پر بیٹھا تھا

اُٹھ کر گورنر جنرل کے سامنے کھڑا ہو جاتا ہے ڈلہوزی لڑکے کے شانوں پر ہاتھ رکھ کر اس کے چہرہ کو تکتا ہے۔ بعد ازاں ہاتھ ہٹا کر رانی کی طرف دیکھتا ہے۔ انند راؤ ہٹکر ڈلہوزی کے قریب فرش پر بیٹھ جاتا ہے اور اُس کے چہرہ کو دیکھتا ہے۔

ڈلہوزی :۔ رانی صاحبہ! ممکن ہے جو کچھ میں کہوں گا وہ سنکر آپ حیران ہوں۔ مگر کاش آپ میری جگہ ہوتیں اور میں آپ کی جگہ یعنی آپ گورنر جنرل ہوتیں اور میں بیوہ رانی، میں جانتا ہوں کہ آپ نے حال ہی میں بڑے بڑے صدمات اُٹھائے ہیں۔ اور آپ کے شوہر گنگا دھر راؤ آنجہانی کی وفات نے آپ کو سخت صدمہ پہونچایا ہے۔ لیکن معاف فرمائیگا آپ کے آلام و مصائب نے سامنے آکر حملہ کیا ہے اور آپ ایک طرح سے اس کے لئے تیار تھیں۔ مگر رانی صاحبہ! میرے آلام و مصائب نے مجھ پر پشت سے حملہ کیا ہے اور ابھی نہ معلوم کیا کیا مصیبتیں مجھ پر پڑنے والی ہیں۔ ابھی سال بھر نہیں ہوا کہ میری بیوی اس ملک کی سخت آب و ہوا کی تاب نہ لاکر مجھ سے جدا ہوئی اور اپنے وطن کو چلی گئی۔ اس نے چھ مہینے تک سخت تکلیفیں اُٹھائیں مگر اُف تک نہ کی اور افسوس ہے کہ گھر کے قریب پہونچتے ہی اس کا انتقال ہو گیا۔ میری دو بیٹیاں جنھیں میں نے کئی سال سے نہیں دیکھا بے ماں کی بچیاں ہو گئیں۔ وہ لڑکا بھی جس کے پیدا ہونے کی میں دعائیں مانگا کرتا تھا۔ میرے دل کو تسکین دیکر میرے دل سے یہ غم کا پہاڑ نہیں ہٹا سکتا۔ میری صحت تباہ ہو گئی ہے۔ اور گویا ہر وہ چیز جس کی وجہ سے میں جان کو جان سمجھتا تھا، میرے لئے فنا ہو گئی ہے۔ اب رانی صاحبہ! میں ایک رنجور و مجبور آدمی رہگیا ہوں۔

(ڈلہوزی جسمانی اور دماغی خستگی کے باعث رک جاتا ہے۔ وہ پھر سنبھلتا ہے اور ایک کر رانی کے سامنے کھڑا ہو جاتا ہے۔ جو خود بھی کھڑی ہو کر اس کی صورت کو تک رہی ہے۔ ڈلہوزی چند قدم بڑھا کر رانی کے قریب آتا ہے اور جلدی جلدی کہتا ہے)

ڈلہوزی :۔ (عمیق اندرونی جذبات سے متاثر ہو کر)۔ رانی صاحبہ! میں جانتا ہوں کہ آپ مجھ سے کیا چاہتی ہیں۔ مگر وہ محال ہے۔ اگر آپ کی جگہ کوئی میرا بھائی بھی ایسی درخواست کرے گا تو میں فوراً انکار کر دوں گا۔ اس لئے رانی صاحبہ آپ کو معلوم ہونا چاہئے کہ جو حشر ستارہ اور ناگپور کا ہوا ہے وہی حشر جھانسی کا ہوگا۔ یہ ایک اُصولی مسئلہ ہے جس میں کوئی استثنیٰ نہیں ہو سکتا۔ ہمیں آیندہ کی فکر کرنی چاہئے اور کمزور کو طاقتور کے لئے جگہ چھوڑ دینی چاہئے۔

(رانی یہ سنکر انند راؤ کو لپٹ جاتی ہے اور رونے لگتی ہے)

ڈلہوزی :۔ لیکن رانی صاحبہ! اس سے آپ رنجیدہ نہ ہوں۔ میں آپ کو اطمینان دلاتا ہوں کہ آپ کے لئے ہر بات کا انتظام ایسا کر دیا جائے گا کہ یہ تغیر ناگوار نہ گزرے گا۔ اپنی ضروریات کی کفالت اور کمار صاحب کی شایان شان پرورش کے لئے آپ کو معقول پنشن دی جائے گی۔ وہ متوفی راجہ کی تمام پرائیویٹ ملکیت کے مالک رہیں گے اور ہم شاہی محل اور

اس کے گرد و نواح کی زمینیں آپ کے اور شاہی خاندان کے لئے چھوڑ دیں گے۔ رانی صاحبہ! سوچئے کہ آپ کو کتنی پریشانیوں سے نجات حاصل ہو جائے گی۔ حکمرانی ایک سعی نامشکور ہوتی ہے۔ اور آپ کو خوش ہونا چاہئے کہ اب یہ کام آپ سے لیا جائے گا۔ اب آپ اپنا تمام وقت کنور صاحب کی تعلیم پر صرف کر سکیں گی۔ اگر وہ ایک محنتی جفاکش اور لایق نوجوان نکلے تو نہ معلوم آیندہ زندگی میں کسقدر عظمت و شان حاصل کر لیں گے۔ اگر آپ چاہیں گی تو تکمیل تعلیم کے لئے ان کو انگلستان بھی بھیج سکیں گی اور میں ان کے لئے بہترین تعلیم و تربیت حاصل کرنے کی ہمیشہ کوشش کروں گا خواہ میں کہیں ہوں۔ (دروازہ کی طرف پھر کر)۔ اب رانی صاحبہ! معاف فرمایئے میں آپ سے رخصت ہونا چاہتا ہوں۔ میری طبیعت اچھی نہیں اور ڈاکٹروں نے مجھے زیادہ محنت کرنے سے منع کر دیا ہے۔ (گرانٹ کی طرف اشارہ کر کے) یہ مسٹر گرانٹ موجود ہیں۔ جو آپ کی پنشن کے معاملہ کا پوری طرح فیصلہ کر دیں گے اور اگر آپ اس کے بارہ میں کچھ کہنا چاہیں گی تو میں نہایت خوشی سے سنوں گا۔

رانی:۔ مائی لارڈ! اب میں کچھ کہنا نہیں چاہتی۔ جب آپ نے مجھ سے کہا کہ دیوتاؤں نے تم کو یہ سزا دی ہے تو میں جان گئی کہ میرے گناہ میرے پیچھے پیچھے پھریں گے۔

(ڈلہوزی رانی کو جھک کر سلام کرتا ہے۔ بعد ازاں دفعتاً آگے بڑھ کر انند راؤ کے پاس جاتا ہے جو روتی ہوئی رانی سے لپٹا ہوا ہے گورنر جنرل اپنا ہاتھ لڑکے کے سر پر رکھتا ہے اور کہتا ہے)

ڈلہوزی:۔ کمار صاحب! اگرچہ جھانسی آپ کے ہاتھ سے نکل جائے گی لیکن آپ حوصلہ کر کے آیندہ زیادہ بڑا آدمی ہونے کی کوشش کریں۔

(اس کے بعد ڈلہوزی جلدی سے نکل کر چلا جاتا ہے۔ رانی روتی کھڑی رہجاتی ہے۔ انند راؤ حیرت زدہ جانے والے گورنر جنرل کی طرف دیکھتا ہے۔ گرانٹ جو اب تک خاموش کھڑا رہا تھا اب ادب کے ساتھ رانی کے پاس آتا ہے)

پردہ گرتا ہے

(باقی)

تذکرۂ معرکۂ سخن شائع ہوگیا

یہ تذکرہ اردو زبان میں اپنی نوعیت کا بالکل پہلا تذکرہ ہے جس میں زمانۂ قدیم سے لیکر موجودہ عہد تک کے تمام مشہور شعراء فارسی و اردو کے کلام پر جو اعتراضات کئے گئے ہیں معہ جواب و محاکمہ یکجا کر دئے گئے ہیں، فن شعر و انشاء کے شائقین کے لئے عجیب چیز ہے۔ قیمت معہ محصول ۱۲؍

مینجر نگار لکھنؤ

کسبی

اگست ۳۴ء کے نگار میں "کسبی" کے عنوان کے ماتحت میرا جو مقالہ شائع ہوا ہے اُس پر بعض "خدا ترس" بزرگوں نے میرے خلاف اظہار خیال کیا ہے۔ خیر یہ اُن کا فرض تھا جس پر مجھے کوئی اعتراض نہ ہونا چاہیے لیکن ان جوابات و اعتراضات کی ضمن میں میں نے یہ محسوس کیا کہ میں نے جن اُمور کو اپنے مقالۂ زیر بحث میں پیش کرنا چاہا ہے اُن کو بخوبی نہیں سمجھا گیا۔ غالباً مقالہ کا ایجاز و اختصار اس کا باعث ہوا ہوگا۔ اس امر کو پیش نظر رکھتے ہوئے میں ضروری سمجھتا ہوں کہ بعض ایسے اُمور کو زیادہ واضح طور پر پیش کر دوں جو میرے پہلے مقالہ میں تشنۂ تفصیل رہ گئے تھے۔ مجھے توقع ہے کہ اگر ان ہر دو مقالات کا بیک وقت دقت نظر کے ساتھ مطالعہ کیا جائے تو غالباً مجھے اس آسانی کے ساتھ "ابلہ فریبی" یا غیر منطقی استدلال کا ملزم قرار نہ دیا جائے گا۔

مجلسے خواہم کہ پیشت گریم و سوزم چو شمع
بر زباں آرم کہ ایں سوز و گداز بہر چیست

"کسبی" کے پیشہ کے حسن و قبح کو معلوم کرنے سے پہلے ضروری ہے کہ "فلسفۂ جُرم" کو بخوبی سمجھ لیا جائے۔ اور چونکہ "جُرم" کا صحیح مفہوم اُسوقت تک واضح نہیں ہو سکتا جب تک کہ "نیک و بد" کے فلسفہ پر غور نہ کر لیا جائے اس لئے سب سے پہلے اس موضوع کو امکانی ایجاز کے ساتھ پیش کیا جاتا ہے۔

بزمی

فلسفۂ نیک و بد نیک و بد کے فلسفہ پر غور کیجئے تو معلوم ہوگا کہ دنیا میں کوئی شے بذاتہٖ نہ اچھی ہے نہ بُری۔ نیک و بد اور اُس کے تمام مترادفات اُسوقت تک بے معنی ہیں جب تک اُن کے مفہوم کو اضافی حیثیت نہ دی جائے یعنی کسی امر کے اچھے یا بُرے ہونے کا معیار اُس کے منافع یا مضار کی نسبت سے قائم کیا جاتا ہے۔ پھر چونکہ دنیا میں کوئی شے نہ تو ضرر محض ہے اور نہ نفع محض اس لئے جب ہم کسی فعل یا کسی شے کے متعلق یہ رائے ظاہر کرتے ہیں کہ وہ

اچھی یا بُری ہے تو ہمارا مطلب یہ ہوتا ہے کہ ہمارے نقطۂ نگاہ کے مطابق اُس کے فوائد یا مضار اُس کے مخالف پہلو کی نسبت سے زیادہ ہیں - اس میں شک نہیں کہ اس عالمِ آب و گل میں ایک کی بقا پر دوسرے کی موت اور ایک کے نشوونما پر دوسرے کی پژمردگی کا عام قانون جاری ہے اور اس لئے ہر وہ چیز جو کسی ایک نقطۂ نگاہ سے مفید ہوتی ہے دوسرے اعتبارات سے مضرت رساں نظر آتی ہے - لیکن انسانی دنیا میں کسی چیز کے حسن و قبح کا معیار اس حیثیت سے مقرر کیا جاتا ہے کہ اس کا پہلوئے ضرر یا نفع عام انسانوں کے لئے اُس کے مخالف پہلو کے اعتبار سے زیادہ شدید ہو - مثلاً دریائے گنگا سے جو نہریں نکالی گئی ہیں وہ انسانی کاشتکاری اور زراعت کے لئے بے انتہا مفید ہیں اور اس لئے ہمارا فیصلہ اُن کے متعلق یہ ہے کہ وہ "اچھی" ہیں اگرچہ اُن سیکڑوں آبی جانوروں کے نزدیک ان کو "بُرا" ہونا چاہئے جو گنگا کے پانی میں ان کی وجہ سے ایک معتد بہ کمی دیکھ رہے ہیں اور جس کی بنا پر اُن کی زندگی کی بہت سی لطافتیں کم ہو گئی ہیں -

انگلینڈ منطقۂ بارد میں واقع ہے جہاں سخت سردی پڑتی ہے اس لئے یہاں کے باشندوں کے نزدیک دھوپ خدا کی بہترین نعمت ہے لیکن افریقہ اور عرب کے استوائی خطوں میں اس سے بدتر مصیبت انسانوں کیلئے اور کوئی ہو ہی نہیں سکتی - یہی وجہ ہے کہ ناروے اور سوئیڈن کے باشندوں میں دوزخ کا جو تصور ہے وہ ایشیا اور افریقہ کے باشندوں کی طرح نہیں ہے کہ وہاں آگ کا عذاب ہو گا یا لوگ دھوپ کی شدید حرارت میں تپیں گے بلکہ اس کے خلاف اُن کے نزدیک دوزخ کا مفہوم یہ ہے کہ وہاں چاروں طرف برف ہی برف ہو گی، سخت سرد ہوائیں چلینگی اور کبھی دھوپ نظر نہ آئے گی -

انسانی افعال کے نیک و بد کا معیار

حسن و قبح کے مسئلہ میں جس طرح اشیاء کا حال ہے اُسی طرح افعال کا ہے - یعنی انسان جو حرکات اپنے اعضاء جوارح کی مدد سے عمل میں لاتا ہے وہ بھی بذاتِ خود نہ اچھی ہوتی ہیں نہ بری - اُن کے حسن و قبح کا مفہوم بھی اضافی ہے اور صرف اس طرح پہچانا جاتا ہے کہ وہ انسان کو فوائد یا نقصانات پہونچانے میں کیا مرتبہ رکھتے ہیں ——— ایک شخص آپ کی توہین کرتا ہے، آپ اُس کے جواب میں ایک طمانچہ مار دیتے ہیں اور اپنے اس فعل کو مستحسن قرار دیتے ہیں - کیوں؟ اس لئے کہ یہ آپ کے لئے مفید ہوا - اس نے آپ کے وقار کی صیانت اور آپ کے نفس کے تحفظ میں مدد کی لیکن مضروب سے پوچھئے کہ وہ آپ کے اس فعل کے متعلق کیا رائے رکھتا ہے -

اسی وجہ سے ابتداء میں انسانی سوسائٹی کو بالاتفاق کسی فعل کے اچھا یا بُرا کہنے میں بڑی دقتیں پیش آئی ہونگی لیکن مدتوں کے تجربہ کے بعد رفتہ رفتہ انسان نے بعض افعال کے متعلق ہمیشہ کے لئے یہ طے کر لیا کہ وہ بُرے یا بھلے ہیں - یعنی یہ سمجھ لیا کہ اُن کا مضر یا مفید پہلو بہ نسبت اُن کے مخالف پہلو کے زیادہ اہم ہے اور اس طرح بعض افعال

کے حسن و قبح کے متعلق جو فیصلہ سوسائٹی نے صادر کیا وہ عالمگیر سچائیوں کی ذیل میں شمار کیا گیا یعنی جس طرح یہ حقیقت ہمیشہ ہمیشہ رہیگی کہ ستارے چمکتے ہیں، بادل گرجتا ہے، پانی کا میلان پستی کی جانب ہوتا ہے، آگ گرم ہوتی ہے اسی طرح بہت سے افعال کے حسن و قبح کا فیصلہ بھی ہمیشہ صحیح رہیگا مثلاً چوری، قتل اور جھوٹ "برا" ہے، صداقت، حلم اور امانتداری "اچھی" ہے۔

مگر ان تمام افعال کی تہہ میں یہ امر نہایت شدت کے ساتھ کارفرما ہوگا کہ آیا اُن کا مفید پہلو زیادہ وقیع ہے یا مضر پہلو۔

لیکن انسان نے اپنے تمام افعال کے حسن و قبح کے متعلق ابدی فیصلے نہیں کئے ہیں بلکہ بہت سے افعال ایسے بھی ہیں جو آب و ہوا کے اثرات، ماحول کی کیفیت، ملک کی حالت یا سوسائٹی کی ضروریات کی وجہ سے وقتی طور پر اچھے یا بُرے کہے جاتے ہیں اس امر کو مثال کے طور پر یوں سمجھئے کہ ایسے وقت میں جبکہ کسی ملک میں جنگ کے شعلے بھڑک رہے ہوں۔ چاروں طرف سے غنیم کی تباہ کاریوں اور خونخواریوں کا ڈر ہو، غارتگری عام ہو تو فطرتاً ملکی افراد کا فیصلہ یہ ہوگا کہ:-

باہر نہ نکلو

روپیہ پیسہ زمین میں دفن کر دو۔

پڑھنے لکھنے کے بجائے فنون حرب سیکھو

عورتوں کو مرہم پٹی کرنا سکھلاؤ ——— وغیرہ وغیرہ۔

اب اگر ملک کی یہی حالت زیادہ عرصہ تک باقی رہے اور لوگ اس کا اندازہ نہ کر سکیں کہ وہ کب تک ختم ہوگی تو اُس کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ تحفظ ناموس و جان کے لئے وقتی طور پر اہل ملک نے جو مذکورۂ بالا فیصلے کئے تھے وہ رفتہ رفتہ اس طرح لوگوں کی زبان پر چڑھ جائیں گے۔

باہر نکلنا بُرا ہے

روپیہ پیسہ زمین میں دفن کرنا اچھا ہے

پڑھنے لکھنے کے بجائے فنونِ حرب سیکھنا اچھا ہے۔

عورتوں کو "مرہم پٹی" سکھلانا اچھا ہے۔

اس مثال کے ذریعہ سے جس حقیقت کو آپ کے ذہن نشین کرانا مقصود ہے وہ یہ ہے کہ ہر قوم اور ہر جماعت اپنی ملکی اور سماجی ضروریات کی بنا پر بہت سی چیزوں کو مفید اور بہت سی چیزوں کو مضر سمجھ کر اُنکے متعلق حسن و قبح کا فیصلہ کرتی ہے لیکن اگر آپ دوسرے ملک کی قوموں پر نظر ڈالیں جن کے حالات اس پہلی قوم سے مختلف ہوں تو آپ کو معلوم ہوگا کہ بہت سے وہ افعال جن کو پہلی قوم بُرا سمجھتی ہے اِس قوم کے یہاں بُرے نہیں ہیں۔

اس امر کو زیادہ وضاحت کے ساتھ سمجھنے کے لئے ذیل کی چند مثالوں پر غور کیجئے :۔

ا۔ اسلام کی بعثت سے قبل عربوں کی زندگی بالکل خانہ بدوشانہ تھی۔ ملک کسی زرعی ترقی کے قابل نہ تھا اور تجارت وصنعت بھی فروغ پر نہ تھی اس لئے ہر قبیلہ دوسرے قبیلہ کو لوٹ لینا اور اُس کی منقولہ وغیر منقولہ جائداد پر غاصبانہ قبضہ کر لینا باعث فخر سمجھتا تھا اور اس بنا پر ہر عرب ہر وقت اپنے آپ کو میدان جنگ میں تصور کرتا تھا۔ ان حالات کے ماتحت اُن کی نظروں کے سامنے ایسے بہت سے واقعات پیش آئے کہ کسی قبیلہ کے افراد ذکور کے قتل ونہب کے بعد اُن کی لڑکیوں اور بیویوں کو ذلت کے ساتھ غلام بنایا گیا۔ اور اس لئے رفتہ رفتہ اُن کے دماغ میں اس خیال نے نشو ونما پائی کہ لڑکیوں کے وجود ہی سے اپنے قبیلہ کو پاک رکھا جائے تاکہ نہ تو جنگ کرتے وقت کسی قسم کا دغدغہ رہے اور نہ مرنے کے بعد کسی ذلت کا خوف۔ ماحول کے اسی اثر کی بنا پر عرب کی سوسائٹی میں " دختر کشی " ایک مستحسن اور پسندیدہ فعل سمجھا جانے لگا لیکن جب اسلام کی تابناک شعاعوں نے اُن کی معاشرتی اور تمدنی ساری زندگی کو منقلب کر دیا تو یہ فعل بھی خود بخود بجائے " اچھا " ہونے کے بُرا ہوگیا۔

۲۔ ہندوستان میں نسبتاً زیادہ امن چین کی زندگی بسر کی گئی ہے، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ لڑکیوں کی تعداد بہت کافی ہوگئی اور ہر مرد کے لئے لڑکی کا بآسانی مل جانا ممکن ہوگیا۔ اس امر نے مرد کی خشونت وطاقت کے ساتھ متحد ہوکر عورت کی پوزیشن کو اتنا صدمہ پہونچایا کہ " عورت " مرد کے سامنے ایک " داسی " سے زیادہ وقیع نہ رہی۔ ہندو سوسائٹی نے عورت کے لئے مرد کو ایک دیوتا بنا دیا اور مرنے کے بعد اُس کے لئے زندہ جل جانا ایک مستحسن فعل قرار پایا۔

۳۔ آئے دن کے جنگ وجدل کی بنا پر عرب میں " دختر کشی " کی جو رسم قائم ہوگئی تھی اُس نے لڑکیوں کی تعداد میں معتد بہ کمی کر دی تھی۔ اس کی وجہ سے وہاں ہندوستان کے مقابلہ میں عورت کا مرتبہ بہت بلند ہوگیا یہی سبب ہے کہ ہندو بیوہ کے نکاح کو آج تک بُرا سمجھتے ہیں، طلاق کو ایک قبیح فعل تصور کرتے ہیں۔ لیکن اہل عرب دورِ جاہلیت میں بھی ان چیزوں کو بُرا نہ سمجھتے تھے۔

۴۔ ہندوستان وایران میں پردہ کی رسم کی بنا پر مرد وعورت کی فطری ملاقاتوں پر جو غیر معمولی بندشیں عائد کی گئیں اُس کا نتیجہ یہ ہوا کہ لوگوں کے جذبات کا رُجحان بے ریش وبروت نوجوانوں کی طرف ہوگیا۔ اور " اہل ذوق " نے انھیں میں " سلو چنا " " زبیدہ " اور " نارا شیرر " کا جلوہ دیکھ کر اُن کے چشم وابرو کے سامنے اپنے گریبان چاک کرنا شروع کر دئے۔ رفتہ رفتہ امرد پرستی کا یہ جذبہ اتنا عام ہوا کہ اُردو اور فارسی شعراء کے خیالات کا مرکز صرف " امرد " بن گیا اور اس کو آج تک معیوب نہیں سمجھا جاتا۔

بحث کے ان تمام اجزا کو پیش نظر رکھنے کے بعد ہم اس نتیجہ پر پہونچتے ہیں کہ دنیا میں اچھے اور بُرے افعال

دو قسم کے ہوتے ہیں:۔

۱۔ وہ افعال جن کے متعلق ایک طویل تجربہ کے بعد انسانی جماعتوں نے بالاجماع یہ طے کر لیا ہے کہ وہ اچھے یا بُرے ہیں اور جو ہمیشہ ایک عالمگیر صداقت کی طرح علیٰ حالہٖ قائم رہیں گے۔ جیسے جھوٹ بولنا بُرا ہے، سچ بولنا اچھا ہے وغیرہ وغیرہ۔

۲۔ وہ افعال جو ہر قوم میں اُن کی ضروریاتِ زندگی کے مطابق اور اُن کے ملکی وجماعتی ماحول کی بنا پر اچھے یا بُرے ہوتے ہیں اور جو اُن حالات کی تبدیلی کے بعد تبدیل ہو سکتے ہیں۔

پہلے حسن وقبح کا نام ہم "حسن وقبح عام" رکھتے ہیں اور دوسرے کا "حُسن وقبح خاص"۔

جُرم

یہاں تک ہم نے جو کچھ کہا ہے اُس کا خلاصہ یہ ہے کہ:۔ ہر وہ فعل بُرا ہوتا ہے جس کے مضر اثرات اُسکے مفید اثرات کے مقابلہ میں زیادہ ہوں۔

لیکن انسانی جماعتیں بالعموم جس فعل کو "بُرے" کے لفظ سے تعبیر کرتی ہیں فلسفہ کی زبان میں اُسے "جرم" کہا جاتا ہے۔ مذہب اُسے "گناہ" کہتا ہے اور ماہرینِ اخلاق (Ethicists) اُس کا نام "سوءِ اخلاق" یا "بداخلاقی" رکھتے ہیں۔

چونکہ اسوقت ہم اپنے موضوع پر خالص فلسفیانہ رنگ میں گفتگو کرنا چاہتے ہیں اس لئے ہم فلسفہ کی اصطلاح کے بموجب انسان کے ہر قبیح فعل کو "جرم" سے تعبیر کریں گے۔

جُرم کا مفہوم "قانونی" نقطۂ نظر سے

یہاں یہ امر ذہن نشین کر لینا ضروری ہے کہ "جرم" کا جو مفہوم "قانون" میں سمجھا جاتا ہے وہ بہت محدود ہے اور اُس کا اطلاق صرف اُن جرائم پر کیا جاتا ہے جن کا بُرا اثر دوسروں پر پڑے اور دوسروں کے لئے شدید طور پر وجہ شکایت پیدا کرے اور جس سے سوسائٹی کے عام امن وآسائش میں خلل واقع ہو۔ لیکن فلسفہ کی اصطلاح میں جُرم کے لفظ سے ایک وسیع مفہوم مراد لیا جاتا ہے جس کے دائرہ میں انسان کے تمام قبیح افعال داخل ہو جاتے ہیں اور اس لئے ہمارے "جرم" کی تشریح کے لئے آپ کو کسی بیرسٹر یا وکیل کے کتب خانہ میں نہ جانا چاہئے بلکہ اُس کو فلاسفی اور نفسیات کے علماء کی کتابوں میں تلاش کرنیکی ضرورت ہے۔

جُرم کا مفہوم فلسفیانہ نقطۂ نظر سے

جُرم کے متعلق اس مفہوم کو پیش نظر رکھتے ہوئے اگر آپ جرم کی ایک جامع ومانع تعریف کریں تو یہ ہوگی:۔

"جرم ایک ایسا فعل ہے جس کے ارتکاب سے خود مرتکب کی ذات پر یا سوسائٹی کے کل یا بعض افراد پر یا کسی ایک واحد ذات پر مضر اثر مترتب ہو"

جرم کی اس تعریف میں "حسن وقبح عام" اور "حسن وقبح خاص" دونوں داخل ہیں اور اب اس تعریف

کے ماتحت جرم کی دو تقسیمیں کی جاسکتی ہیں۔ یعنی

ا — وہ جرائم جن کا بُرا اثر صرف آپ کی ذات پر مترتب ہو اور دوسرے لوگوں کو اُس سے کوئی نقصان نہ پہونچے مثلاً دولت کا بُری طرح ضائع کردینا، یا بخل سے کام لیکر اپنے آپ کو ضروری آسائش سے محروم رکھنا، رات کو دیر کرکے سونا، کھانے میں احتیاط نہ برتنا وغیرہ وغیرہ —— یہ سب چیزیں چونکہ آپ کے نفس کو نقصان پہونچاتی ہیں اس لئے "بُری" ہیں اور اسی بنا پر ایک فلسفی کی نظر میں "جُرم" ہیں۔

اس قسم کے تمام جرائم کو ہم "شخصی جُرم" سے تعبیر کرتے ہیں۔

۲ — وہ جرائم جن کا مضر اثر دوسروں تک متعدی ہو۔ جیسے چوری، قتل، ضرر شدید وغیرہ — دنیا کی وہ تمام اشیاء جو جماعت کی ملک ہیں اگر اُن کو آپ کی ذات سے نقصان پہونچے یا آپ اُن میں اس طرح تصرف کرنا چاہیں کہ جس سے جماعت کے دیگر افراد کے حقِ استفادہ کو صدمہ پہونچتا ہو تو وہ فعل بھی جماعتی جرم کی ذیل میں آجائے گا، مثلاً جنگل کے درختوں یا عام شاہراہوں پر بیجا حقِ تملیک جتانا۔ یہی وجہ ہے کہ ایسا دفینہ جس کا کوئی وارث نہ ہو اگر آپ کو اتفاقاً کسی جنگل یا ویرانے میں مل جائے تو "قانونی" اعتبار سے آپ اُس کے مالک قرار نہیں پاسکتے کیونکہ اُس کی حیثیت جنگل کے اُن درختوں کی سی ہے جن سے مستفید ہونے کا استحقاق جماعت کے ہر فرد کو ہے اور اس لئے دفینہ کی ملکیت میں قوم کا ہر فرد برابر کا شریک ہے۔

الغرض اس قسم کے تمام جرائم کا نام ہم "جماعتی جرم" رکھتے ہیں۔

"جُرم" اور سزائے قانونی

ہم اوپر بتا آئے ہیں کہ قانون کی نظر میں صرف وہ افعال "جُرم" قرار پاتے ہیں جن کا مضر اثر دوسروں تک پہونچے اور جو سوسائٹی کے عام امن و آسایش میں خلل انداز ہوں۔ چنانچہ اس اعتبار سے قانون میں صرف ایسے جماعتی جرائم قابلِ سزا ہوتے ہیں جو بڑی حد تک بدامنی کا باعث ہوں۔ اسکے علاوہ اُن تمام "جماعتی جرائم" سے جو ایسے نہ ہوں اور نیز تمام "شخصی جرائم" سے "قانون" کو کوئی سروکار نہیں ہوتا۔ اُن کی سزا سوسائٹی اپنے طور پر دیتی ہے مثلاً بخیل سے نفرت کرتی ہے۔ اُس کی عزت نہیں کرتی، مہذب محفلوں میں مختلف طریقوں سے اُس کی توہین کرتی ہے۔ اُس کی مناسب امداد کرنے سے دستکش رہتی ہے وغیرہ وغیرہ۔ لیکن قانونی نقطۂ نگاہ سے بخیل کو نہ مجرم قرار دیا جائے گا اور نہ پولیس اُس سے تعرض کرے گی۔

یہی وجہ ہے کہ دفینہ پانے کے بعد اگر آپ اُس کی اطلاع حکومت کو نہ دیں اور خاموشی کے ساتھ اُسکو تصرف میں لے آئیں تو حکومت کے سپاہی آپ کو پابجولاں بنا دیں گے۔ لیکن اگر اپنی ذاتی دولت کو آپ جمع کئے بیٹھے رہیں اور سخت سے سخت جسمانی و روحانی مصائب برداشت کرنے کے باوجود بھی اُسے خرچ کرنا گوارا نہ کریں تب بھی "قانون" آپ کے راستہ میں حائل نہ ہوگا۔

لیکن ابتدائً سوسائٹی نے بہت سے "شخصی جرائم" کے خلاف بھی سزائیں تجویز کی تھیں مثلاً جو قانون مذہب نے مرتب کیا تھا یا جو اگلے زمانہ کے روایتی عقائد پر مبنی تھا اُس میں عبادت نہ کرنے پر سزا تھی، اسلام میں نماز نہ پڑھنے پر قید کا حکم ہے - ارتداد کی صورت میں قتل کیا جاتا ہے لیکن آج کل بارگاہِ قانونی سے یہ فیصلہ صادر ہوا ہے کہ قانون کے تحت میں صرف اُن جرائم کو قابلِ سزا سمجھا جائے گا جن کا بُرا اثر دوسروں تک متعدی ہو، جو سوسائٹی کی عام فلاح و بہبود کے منافی ہوں، اور جن سے امن و آسائش عامہ کو صدمہ پہونچے -

اسی لئے قانون میں زنا بالجبر جرم ہے لیکن زنا بالتراضی جُرم نہیں - لیکن اغلام بالتراضی بھی جرم ہے اس لئے کہ عام طور پر یہ سمجھا گیا ہے کہ یہ فعل فطرتِ سلیمہ کے مخالف ہے اور سوسائٹی کی عام فلاح و بہبود پر اس کا مضر اثر پڑتا ہے - ممکن ہے کسی زمانہ میں یہ نظریہ بدل جائے جیسا کہ کچھ دن ہوئے فرانس کے رسائل و اخبارات کے صفحات پر یہ بحث نہایت زور شور سے چل رہی تھی کہ ---- آیا اغلام بالتراضی کو قانوناً جرم ہونا چاہئے یا نہیں -

"جُرم" کے مسئلہ میں تمام بحث کا خلاصہ

الغرض یہاں تک ہم نے جس امر کی وضاحت کی ہے وہ یہ ہے کہ فلسفہ کے نقطۂ نگاہ سے ہر "بُرا" فعل جُرم ہے، اور اس اعتبار سے جُرم کی دو قسمیں ہیں شخصی اور جماعتی - اور یہ بھی واضح کر چکے ہیں کہ جماعتی جرائم کے لئے یہ ضروری نہیں کہ وہ ہمیشہ جُرم رہیں بلکہ ہو سکتا ہے کہ سوسائٹی کا کوئی فیصلہ کسی خاص وقت اور کسی ماحول کے ماتحت جُرم کی ذیل میں داخل ہو لیکن اُن حالات و ماحول کے تبدیل ہو جانے کے بعد وہ جرم نہ رہے، (ملاحظہ ہوں امثلۂ مذکورۂ بالا) یا یہ بھی ممکن ہے کہ کسی جُرم کے متعلق سوسائٹی نے جو فیصلہ صادر کیا ہو وہ سرے سے غلط ہی ہو -

فلسفۂ جرم کے اعتبار سے "کسبی" کے پیشہ کی تحلیل

فلسفۂ جرم کے متعلق ان تمام تفصیلات کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے اب ہم "کسبی" کے پیشہ پر نظر ڈالتے ہیں اور دیکھتے ہیں کہ آیا اُس کو جرم کہا جا سکتا ہے یا نہیں -

ظاہر ہے کہ قانون کی نظر میں تو یہ پیشہ جُرم نہیں ہے - لیکن ہمارے جماعتی اور سماجی فیصلہ کے مطابق یہ حد درجہ قبیح جرم ہے - اور اس لئے ہماری بحث صرف اسی اعتبار سے ہوگی -

"کسبی" کی عصمت فروشی

"کسبی" کے خلاف جو زبردست ترین جرم عائد کیا جاتا ہے وہ "عصمت فروشی" کا جرم ہے - اگر تھوڑی دیر کے لئے یہ تسلیم کر لیا جائے کہ "کسبی" کا یہ فعل جُرم ہے تو فطرتاً یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ وہ جُرم کی کونسی قسم ہے ---- آیا "جماعتی" جرم ہے یا "شخصی" جرم ؟

ظاہر ہے کہ اگر "عصمت فروشی" حدِ اعتدال سے تجاوز نہ کرے تو وہ "شخصی جرم" نہیں ہے - اب اگر اسکو جرم کے کسی شعبہ میں داخل کیا جا سکتا ہے تو وہ "جماعتی جرم" ہی ہو سکتا ہے لیکن مرد و عورت کے اتصال کی تین اہم اغراض (یعنی ---- (۱) بقائے نسل (۲) بچوں کی پرورش یا تدبیرِ منزل - اور (۳) آلامِ حیات سے آسودگی) میں سے

چونکہ ایک بڑی غرض "آسودگیِ نفس" بھی ہے اس لئے جب تک "کسبی" کا وجود اِس غرض کی تکمیل کرتا ہو اُسوقت تک "عصمت فروشی" کو جماعتی جرم بھی نہیں کہا جا سکتا۔

بحث کے اس پہلو کو ہم اپنے سابقہ مقالہ میں نہایت تفصیل کے ساتھ بیان کر آئے ہیں اس لئے دوبارہ اعادہ کرنے کی حاجت نہیں ہے۔ البتہ بعض اُمور ایسے ہیں جو مقالہ محوّلہ میں زیادہ وضاحت سے بیان نہ ہوئے تھے اس لئے اُن پر یہاں تفصیل کے ساتھ نظر ڈالی جائے گی۔ بدیں وجہ ضروری ہے کہ پہلے اس مسئلہ میں ہماری سابقہ بحث کا بغور مطالعہ کر لیا جائے۔

"کسبی" کا مفہوم سب سے پہلے میں یہ واضح کر دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ کسبی کا مفہوم کیا ہے۔ میرے نزدیک "کسبی" عبارت ہے ــــ ہر اُس نوجوان (نوجوان کا عام مفہوم سمجھئے یعنی جو "آئسہ" نہ ہو) عورت سے جو اپنے حسنِ ظاہری کے ساتھ "فنونِ لطیفہ" یعنی موسیقی وغیرہ سے بخوبی آشنا ہو۔ جو اُٹھنے بیٹھنے اور گفتگو کرنے کے آداب سے کماحقہ واقف ہو اور جس کی معیت میں انھیں اُمور کی بنا پر مرد کے لئے بے انتہا کیفیت پنہاں ہو۔

یہ ہے میرے نزدیک "آئیڈیل کسبی"۔ اور اس لئے ہر وہ عورت جسے فنِ لطیف تو درکنار بات کرنیکا بھی سلیقہ نہ آتا ہو اور جو صرف "عصمت" کی قیمت پر مرد کی خاطر کر سکتی ہو میری تعریف سے خارج ہے۔ شاید میرے اس مفہوم کو "کسبی" کے مقابلہ میں "طوائف" کا لفظ زیادہ صحت کے ساتھ ادا کر سکے۔

یہی وجہ ہے کہ صرف اسی مفہوم کو سامنے رکھتے ہوئے رقاصہ، مغنیہ اور مطربہ کی قسم کے تمام الفاظ میرے نزدیک ہم معنی ہو جاتے ہیں۔ نغمہ و طرب اور رقص و سرود ایک "کسبی" کی زندگی کے اتنے اہم اجزا ہیں کہ اگر اُسکو اُن سے علیحدہ تصور کیا جائے تو اس پیشہ کے استحسان و جواز کے تمام راستے یکدم بند ہو جاتے ہیں۔ اور اس لئے اگر "کسبی" کی زندگی کے اس اہم عنصر کو ملحوظ رکھتے ہوئے اُس کو صرف مغنیہ، رقاصہ یا مطربہ کے الفاظ سے تعبیر کیا جائے تو زیادہ مناسب ہے۔ اور اس لئے اب میں بجائے کسبی کے مطربہ کا لفظ استعمال کروں گا۔

لیکن اس سے یہ مطلب بھی نہ سمجھ لیا جائے کہ میں جس مطربہ سے بحث کر رہا ہوں عصمت فروشی اُسکے دائرہ سے خارج ہے۔ اس کے برخلاف میرا مطلب صرف یہ ہے کہ عصمت فروشی اُس کی بارگاہ میں محض ثانوی حیثیت رکھتی ہے ــــ اُس کا اصل فن صرف اُس کی معیت اور مصاحبت کا لطف ہے، گویا "میری کسبی" ایک ایسی حسین نوجوان لڑکی ہے جو علم مجلسی سے بخوبی واقف ہو، ہر موضوع پر دلچسپ انداز سے گفتگو کر سکتی ہو، بہت خوش سلیقگی کے ساتھ ہر ایک بات کا جواب دیتی ہو اور بات بات پر خود مسکراتی اور دوسروں کو ہنساتی ہو۔ اُس کے ساتھ گھنٹوں بیٹھے رہنے کے بعد بھی تمناؤں کا طوفان کم نہ ہو۔

بقول قیس ابن الخطیم :-

تغترق الطرف وھی لاہیۃ　　کانما شفّ وجہہا نزف

وہ بے توجہی کے ساتھ کبھی اور طرف دیکھتی ہوتی ہے لیکن دیکھنے والوں کی نظریں اُس کے غیر فربہ چہرہ پر گڑ جاتی ہیں جس پر ہلکی ہلکی زردی جھلکتی ہے۔

ولا یغث الحدیث ما نطقت　　وہو بفیہا ذو لذۃ طرف

جب وہ بولتی ہے تو اُس کی گفتگو سے دل نہیں اُکتاتا۔ اُس کے منھ سے جو جملہ نکلتا ہے ایک نئی لذت رکھتا ہے۔

تخزنہ وہو مشتہی حسن　　وہو اذا ما تکلمت انف

وہ بات کر کے چپ ہو جاتی ہے لیکن دل اُس کی گفتگو سننے کو تڑپتا رہتا ہے۔ اُس کی گفتگو کا ہر موضوع بالکل اچھوتا ہوتا ہے۔

میرے نزدیک "کسبی" کا مفہوم وہ ہے جس کے نام پر واجد علیشاہ کے دربار میں "پریاں" جمع کیجاتی تھیں اور ایک "کسبی" کے لئے وہ تمام صفات ضروری و لابدی ہیں جن کی تعلیم لکھنؤ کے اس زندہ دل فرمانروا کی حرم سرا میں ان حسین "فتنوں" کو دیجاتی تھی۔

جو "کسبیاں" اِن صفات سے معرا ہیں وہ حقیقۃً "آلام حیات سے آسودگی" کے اہم مقصد کو انجام ہی نہیں دے سکتیں۔ اور اس لئے خالص عصمت فروشی سے کسب زر کرنا یقیناً ایک ناقابل معافی جرم ہے۔ بلاشبہ اس کے جواز میں کوئی دلیل پیش نہیں کی جاسکتی۔ پنجاب اور بمبئی وغیرہ میں اس قسم کی کسبیوں کی جو کثیر تعداد پائی جاتی ہے اُن کے مسکنوں کو اگر آگ لگائی جائے تو سب سے پہلے میں اس کی تائید میں حرکت کروں گا۔

"تجارت معصیت" کی واقعی ذمہ داری کس پر ہے؟

اگرچہ اس قسم کی کسبیوں کو میں سزاوار ملامت سمجھتا ہوں لیکن پھر بھی اُن پر رحم ضرور آتا ہے اس لئے کہ بظاہر تو آپ سمجھتے ہیں کہ یہ آپ کو لوٹ لیتی ہیں گھر اسکے گھرانے تباہ کر دیتی ہیں، نوجوانوں کو دیوانہ بنا دیتی ہیں لیکن آپ کو کیا معلوم کہ ان "غریبوں" کی ایک کثیر تعداد یہاں بھی ایک مرد کے ہاتھوں میں کٹھ پتلی کی طرح ناچتی ہے، وہ جو کچھ کرتی ہے کسی اور کے اشارہ ابرو سے کرتی ہے جو ماموں، خالو اور چچا تائے بنکر اُس کے "سرپرست" کہلاتے ہیں اور صبح سے شام تک اُسے اس فن کا درس دیتے رہتے ہیں۔ وہ جو کچھ خون پسینہ بہا کر حاصل کرتی ہے اُس کے وہ تنہا مالک ہوتے ہیں اور وہ خود صرف اُن کے رحم پر رہتی ہے۔ اگر یقین نہ آئے تو کشمیر جا کر معلوم کیجئے کہ وہاں سے ہر سال کتنی لڑکیاں محض اس غرض کے لئے لائی جاتی ہیں۔ وہاں کے اُس قانون کے اغراض و مقاصد کو پڑھئے جو صرف اسی کی روک تھام کے لئے معرض وجود میں لایا گیا ہے۔ لاہور اور بمبئی وغیرہ کے بازاروں میں تحقیق کیجئے کہ ایک ایک

مرد کے پاس کتنی لڑکیاں ہوتی ہیں جن سے وہ مستقل تجارت کرتا ہے لیکن بظاہر اُن کا چچا یا ماموں کہلاتا ہے۔ اور اس لئے اگر یہ "پیشہ" ننگِ انسانیت ہے تو اس کے ذمہ دار خود ہم ہیں۔ ہم خود ہی اپنا خون چوس رہے ہیں، خود ہی اپنی گردن میں موت کا پھندا ڈال رہے ہیں، خود ہی ذلت و رسوائی کے اِس غار میں گر رہے ہیں۔

بیوی سے "آلامِ حیات کی آسودگی" ممکن ہے

میں نے اپنے گزشتہ مقالہ میں یہ ظاہر کیا تھا کہ مرد و عورت کے اتصال کے تین اہم اغراض ہیں ــــ (۱) بقائے نسل (۲) بچوں کی پرورش یا تدبیرِ منزل (۳) آلامِ حیات سے آسودگی۔ اور اس کے بعد یہ تبلایا تھا کہ "مطربہ" کی زندگی کے مقاصد میں صرف تیسری غرض کی تکمیل کرنا داخل ہوتا ہے۔ لیکن اس سے یہ نہ سمجھ لیا جائے کہ میں نے عورت کے مقاصد کی اس تقسیم کے بعد یہ طے کر لیا ہے کہ "بیوی" سے ان ہر سہ اغراض کی تکمیل ناممکن ہے۔ یعنی میرا مطلب یہ ہرگز نہیں ہے کہ بیوی صرف اول الذکر دو اغراض کی تکمیل کرتی ہے اور تیسری غرض کے حصول کے لئے ہم کو کسی "مطربہ" کے "کوٹھے" پر جانے کی ضرورت ہے۔ اس کے بالکل خلاف میرا مقصد اس تقسیم سے صرف اتنا ہے کہ "مطربہ" کے مقصدِ حیات کے استحسان کو واضح کر دیا جائے عام اس سے کہ بیوی کے ذریعہ سے مذکورہ بالا تینوں اغراض پوری ہوں یا نہ ہوں ... ہاں یہ ضرور ہے کہ عصمت شکنی کے جس جُرم کو بُرا کہا جاتا ہے وہ صرف اُسی وقت بُرا ہے جبکہ عورت کے مقصدِ حیات میں بقائے نسل اور تدبیرِ منزل داخل ہوں۔

یقیناً ہمارے گھروں میں ایسی بیویوں کا کال نہیں ہے جو اتصالِ مرد و زن کے ان ہر سہ اغراض کی تکمیل کرتی ہوں لیکن بالعموم ایسی بیویوں کا وجود آٹے میں نمک کے مترادف ہے۔

ہماری "بیویاں"

ہمارے گھروں کی معاشرت کچھ اس نہج کی واقع ہوئی ہے کہ اُس میں لڑکی کو بچپن سے اس تیسری غرض کی تکمیل کے لئے تیار ہی نہیں کیا جاتا۔ آپ کسی جگہ شادی کی درخواست بھیجئے تو لڑکی کی خوش سلیقگی، سینے پرونے، اور حُسنِ کردار کے بعد حُسنِ صورت کا مرتبہ رکھتے ہیں لیکن مشرق کے ایک لاکھ گھرانوں میں سے شاید ایک گھر بھی ایسا نہ ہو جہاں لڑکی میں "فنونِ لطیفہ" کے کمال کو دیکھا جائے۔ یہ دریافت کیا جائے کہ وہ موسیقی میں کتنی ماہر ہے؟ اُس کو پیانو، ہارمونیم اور بنجو وغیرہ بجانا آتا ہے؟ موضوعاتِ حاضرہ پر خوشگوار انداز سے گفتگو کر سکتی ہے؟ ہر سوال کے بے ساختہ لطیف جواب دینے کا ملکہ اُس نے اپنے اندر پیدا کیا ہے؟ وغیرہ وغیرہ۔

اس کے برخلاف ہماری "بیویوں" کا تو یہ عالم ہے کہ وہ مشکل سے کسی بات کا جواب مسرور کُن انداز سے دے سکتی ہیں، سیاسیات و معاشرت کے سینکڑوں دلچسپ مباحث سے قطعاً نابلد ہیں، علمی و عملی زندگی کا کوئی شگفتہ سے شگفتہ پہلو بھی ایسا نہیں ہے جس پر آپ اُن سے رائے زنی کر سکیں۔ جب تک گھر میں رہئے ایک مخصوص

قسم کی تعجب انگیز (Sensational) گفتگو سنتے رہئے اور سنتے سنتے بالآخر ایک قنوطی، بحس اور جامد مجسمہ بنکر رہجائیے۔

بعض اوقات ہم خاموش رہنا چاہتے ہیں لیکن وہ تکلیف دہ انداز سے بولنا شروع کردیتی ہے، ہم سوچ رہے ہوتے ہیں وہ ٹوک دیتی ہے۔ ہمارا دماغ مختل ہوتا ہے اور ایک پُرکیف منظر چاہتا ہے اور وہ گھر کے قضیے لے بیٹھتی ہے، ہم اپنے مصائب سے آرام چاہتے ہیں اور وہ عین اُسی وقت رو رو کر ساس نند کے جھگڑے دُہرانے لگتی ہے ۔۔۔۔۔۔ کیا "آلام حیات سے آسودگی" اس طرح نصیب ہوسکتی ہے؟

نوجوان اور بالخصوص تعلیمیافتہ اور لطیف وپاکیزہ ذوق والے نوجوان، عورتوں میں اس کمی کو شدت سے محسوس کررہے ہیں۔ بلکہ میں تو یہاں تک کہنے کو تیار ہوں کہ اگر یہی حال چندے اور رہا تو وہ وقت دور نہیں جب "نکاح" کی قدر بھی ہمارے قلوب سے بالکل فنا ہوجائے گی اور ہر نوجوان کسی "مطربہ" کے صدائے خلخال پر جھومتا نظر آئے گا۔

بہرحال اگر بیوی سے یہ تمام اغراض پوری ہوجائیں تو چشم ما روشن دلِ ماشاد لیکن ہماری سوسائٹی کی موجود حالت تو یہ ہے کہ ایک طرف تو ہماری "بیویاں" اس "دادی" سے قطعاً ناآشنا ہیں اور دوسری طرف "مطربہ" صرف اسی فن کو اپنے لئے مخصوص کرلیتی ہے۔ پھر جس طرح ایک ادیب کی خصوصیات میں یہ داخل کرلینے سے کہ وہ بہترین "شاعر" بھی ہو اور عمدہ "نثر نگار" بھی یہ لازم نہیں آتا کہ اگر کوئی شخص صرف نثر نگار ہو تو وہ بُرا ہے اسی طرح اگر "مطربہ" اپنے مقصدِ حیات میں "اتصالِ مرد و زن" کے صرف ایک پہلو کو پیش نظر رکھتی ہے تو اُس کو بھی بُرا نہیں کہا جاسکتا۔

چند مناظرِ "طرب" آپ اپنی بیویوں کی معاشرت تو روز دیکھتے ہیں۔ آئیے چند منٹ میرے اس آئیڈیل پر بھی غور کیجئے:۔ ایک مرتبہ میرے ایک دوست کو اپنی بیوی کے طرزِ عمل سے سخت بیچینی پیدا ہوئی۔ مجھ سے شکایت کرنے آئے، اور کہنے لگے "میں اس کا کیا علاج کروں کہ "وہ" جو کچھ کہتی یا کرتی ہیں بالکل نیک نیتی سے کرتی ہیں۔ اور مجھے اس کا بھی یقین ہے کہ وہ میرے ہر حکم کو ایک خادمہ کی طرح ماننا اپنا فخر سمجھتی ہیں۔ لیکن ان تمام باتوں کے باوجود اپنی جہالت و نادانی کی وجہ سے میرے دماغی سکون کے لئے مستقل عذاب بنی ہوئی ہیں"۔

اِس کرب واضطراب کے دفعیہ کے لئے وہ کسی "محفلِ طرب" میں پہونچ گئے۔ مگر چہرہ سے مسرت مفقود تھی، بولنے کو دل نہ چاہتا تھا۔ اُن سے پوچھا گیا:۔

"آج آپ کے اس غیر معمولی سکوت کی وجہ؟"

اس کے جواب میں وہ مبہم انداز سے کچھ ہوں، ہاں کہہ کر چپ ہو گئے۔ لیکن جب اُن سے مسلسل اصرار کیا گیا تو جھنجھلا کر کہنے لگے :۔

توائے کبوترِ بامِ حرم چہ مے دانی
طپیدنِ دلِ مرغانِ رشتہ بر پارا

(ایک لطیف قہقہہ کے ساتھ) "ماشاء اللہ! شعر بھی آپ کو ملا تو کوئی ہزار برس کا فرسودہ۔ یہی پڑھ دیا ہوتا:۔

بزیرِ شاخِ گل افعی گزیدہ بلبل را
نوا گرانِ نخوردہ گزند را چہ خبر

(کسیقدر تبسم کے ساتھ) — جی ہاں میں تو پہلے ہی سمجھتا تھا کہ آپ کی زد سے کون بچ سکتا ہے۔

ناوک نے تیرے صید نہ چھوڑا زمانہ میں
تڑپے ہے مرغ قبلہ نما آشیانہ میں

(خندۂ دنداں نما کے بعد) پھر وہی فرسودگی۔ کبھی تو اپنی لطافتِ خیال کا ثبوت دیجئے .... ادھر دیکھئے .....

کسے نماند کہ دیگر بہ تیغِ ناز کشی　　　مگر کہ زندہ کنی خلق را و باز کشی

اس مختصر سی تمہید کے بعد اُن کے دماغ کی دنیا یکسر پلٹ گئی۔ اور اس کے بعد کی گفتگو سے یہ اندازہ کرنا مشکل تھا کہ چند لمحے پیشتر وہ سرتاپا جمود و خموشی بنے ہوئے تھے۔

خودرو پودوں کی طرح ہندوستان کی فضا میں جو لاکھوں غزلگو شاعر پیدا ہو گئے ہیں ان میں سے کوئی ایک بیٹھا "گل و بلبل" کے "افسانے" سُنا رہا تھا، طبیعت سنتے سنتے اُکتا گئی مگر اُس کو احساس کہاں جبکہ چند "بلند ذوق" "مستقل" "ہنگامۂ داد" بپا کئے ہوں۔

غزل ختم ہوئی اور خفیف سا سکوت ہوا کہ "نشاطِ حسن" کی سیمابی تیسری نے ایک ہلکی سی ترنم ریز آواز میں کہا، "میں نے بھی اس "طرح" میں کچھ عرض کیا ہے"

سب کی نظریں اس طرف جم گئیں۔ اور غزل شروع ہوئی۔ ایک شعر تھا:۔

ہر ذرۂ امکانِ حیاتِ ابدی سے
اوجِ شرفِ خاکِ ثریا نہ ہوا تھا

سننے والوں نے کہا:۔ "واللہ کیا نزاکتِ خیال ہے ...."
"اقبال و غالب کا رنگ ہے۔ مگر اس سے زیادہ دلکش"

"لیکن یہ "امکان" کے نون کو غیر ظاہر ہونا چاہئے تھا"

"یہ غلطی تو اقبال نے بھی کی ہے ——————— "منزلِ دہر سے اونٹوں کے حُدی خوان گئے"

(تبسم کے ساتھ) "مگر میرے شعر میں تو "امکان" "حیات" کی طرف مضاف ہے۔

ہر ذرۂ امکان حیاتِ ابدی سے

"اوہو! بالکل ٹھیک، اللہ اکبر!! کتنا بلند شعر ہے"

لیکن کتنا پر ظرافت تھا وہ منظر جب ایک خاص سنجیدگی کے ساتھ یہ کہا گیا:۔

"آپ کی قدر افزائی کا شکریہ ...... مگر غزل کے کسی مصرع میں میں نے با معنی ہونے کا خیال نہ کیا تھا"

ایک نوجوان نہایت غم و غصہ کے ساتھ اپنی بیوی کے احمقانہ کردار کی شکایت کر رہے تھے۔ اور ساری "کتھا" ختم کرنے کے بعد اس کے خواستگار ہوئے کہ اُن کے ساتھ ہمدردی کیجائے۔ آدمی کہنہ خیال اور احمق سے تھے اور موجودہ "دہریت و ارتداد" کے خلاف اکثر لکچر دیا کرتے تھے۔ اس تمام داستانِ الم کے بعد کہنے لگے

"مگر ہماری قسمت ہی میں یہ لکھا تھا"

(مصنوعی سنجیدگی کے ساتھ ہلکے سے تبسم سے) آپ سے ہزار دفعہ کہا کہ جب بیوی کے پاس جایا کیجئے تو تین مرتبہ قل ہو اللہ پڑھ کر دم کر دیا کیجئے مگر آپ مانتے ہی ہیں ...... آپ کو معلوم ہیں اس کے صفات؟"

دفعتہً گفتگو کا رُخ پلٹ گیا۔

ایک صاحب مستقل طور پر بتکلف انگریزی بول رہے تھے۔ یکایک اُن کو کچھ احساس ہوا تو فرمانے لگے:۔

"کیا بتاؤں میری اُردو بہت ناقص ہے ...... مگر آپ تو انگریزی جانتی ہوں گی؟"

"جی، میں انگریزی سے اُتنی ہی واقف ہوں جتنا آپ اپنی "وطنی زبان" سے"

ایک مرتبہ ایک صاحب بالکل "کانگریسی" لباس میں گاندھی کیپ لگائے تشریف لائے۔ کمرے میں داخل ہوتے ہی اُن سے کہا گیا:۔ "اوہو! یہ آج آپ اُلٹا ھرل سر پر کیوں رکھ لائے؟"

نوجوانوں کی دولت کو بیرحمی کے ساتھ لوٹ لینا

"مطربہ" کے پیشہ کے خلاف عصمت فروشی کرنے اور محبت کے نام پر دھوکہ دینے کے علاوہ ایک اہم اعتراض یہ ہے کہ وہ نوجوانوں کو اپنے دام میں اس طرح

پھانستی ہے کہ آہستہ آہستہ اُن کی ساری دولت اپنے قبضِ تصرف میں لے آتی ہے اور اُن کی دولت کو بے رحمی کے ساتھ لوٹ لینے کے بعد جب وہ نانِ شبینہ تک سے محتاج ہو جاتے ہیں تو نفرت وحقارت کے ساتھ اُنھیں اپنی بارگاہ سے نکلوا دیتی ہے لیکن میں سمجھتا ہوں کہ گو بعض خاص مثالیں اس نوع کی مل جائیں لیکن زیادہ تر ایسا نہیں ہوتا۔ مردوں نے اپنے اردگرد کی نوجوان عفیف لڑکیوں کو تباہ کرنے میں جتنا حصہ لیا ہے اُس کے مقابلہ میں مطربہ کی تباہ کاریاں صفر کا درجہ رکھتی ہیں۔ مجھے تو ایسے قصّے بھی معلوم ہیں کہ دہلی کی بعض "طوائف" نے صرف اتنا معلوم ہونے پر کہ اُن کے بعض قدر دانانِ نغمہ و ترنم علیگڈھ کالج سے تعلق رکھتے ہیں اور اُن کی پوزیشن ایک طالب علم سے زیادہ نہیں ہے اُن سے "شرکتِ محفل" کا کوئی معمولی معاوضہ لینا بھی گوارا نہ کیا ـــــ میرے "علیگیرین" احباب مجھے اُن کے اس "اجمالی افشائے راز" میں معاف فرمائیں۔ ہاں یہ صحیح ہے کہ محض الفاظ کے فریب سے اُسے دام میں نہیں لایا جا سکتا۔ اور غالباً یہی سب سے بڑی وجہ ہے جس کی بنا پر ہمارے "خوش فکر وخوش نظر" ادیب "استلذاذ بالمثل" کو بھی اس کے مقابلہ میں مرجح سمجھتے ہیں۔

"مطربہ" کی عصمت فروشی

مطربہ کی عصمت فروشی کا ڈھول بڑی شدت سے پیٹا جاتا ہے اور اسی بنا پر اُس سے نفرت کی جاتی ہے لیکن ہمارے ملک کے "خوش فکر وخوش ذوق" شعراء و اُدباء سے پوچھئے کہ وہ اُن بے ریش و بروت لڑکوں اور نوجوان لڑکیوں کی "ملاقاتوں" کے متعلق کیا رائے رکھتے ہیں جو ایک حیثیت سے اُن کی نگاہ محبت و دیوانگی کا مرکز ہوتی ہیں۔ حقیقۃً اگر صرف عصمت فروشی قابلِ نفرت سمجھی جاتی تو ہمارے ملک کے شاعروں، ہمارے کالج کے پروفیسروں اور ہماری درسگاہوں کے طالب علموں کے واسطے ملامت سے بچنے کے لئے دُنیا میں کوئی راہِ نجات میسر نہ آتی۔ لیکن ہماری سوسائٹی کی جو کچھ حالت ہے وہ اس سے ظاہر ہے کہ جس نوجوان کی زندگی کے تجربات میں کم ازکم دو تین دوشیزہ لڑکیوں اور چند حسین "نوخیز لڑکوں" کی فریب دہی کے "رومانی" واقعات شامل نہ ہوں وہ جمالیاتی احساس سے یکسر بیگانہ سمجھا جاتا ہے۔ اور اُس کی معیت ومصاحبت ہر ایک کے لئے وبالِ جان ہوتی ہے۔

ہندوستان کے ایک مشہور مدرسۃ العلوم میں ایک حسین لڑکی بی۔ اے میں داخل ہوئی۔ چونکہ حُسن کے علاوہ ثروت و دولت سے پوری طرح بہرہ یاب تھی اس لئے پروفیسروں تک کی نگاہوں کا واحد محور بن گئی چنانچہ ایک فاضل پروفیسر نہایت فخر کے ساتھ اپنا یہ واقعہ بیان فرماتے ہیں "ـــــ ایک دفعہ میں اور وہ تنہا بیٹھے تھے ـــ میں نے کہا:-

"میں آپ سے ایک چیز مانگنا چاہتا ہوں۔"

"فرمائیے"

"مگر ایسا نہ ہو کہ میری استدعا رد کر دی جائے"

"آپ بھی کیسی باتیں کرتے ہیں"

"ایک بچہ"

یہ واقعہ اُن کی زندہ دلی، ظرافت طبعی اور خوش ذوقی کی اعلیٰ مثال سمجھی جاتی ہے۔ میں نے اس قسم کے بہت سے لوگوں سے دریافت کیا کہ آخر وہ کیوں "نوخیز لڑکوں" پڑوس کی عفیف کنواریوں یا شہر کی غریب عورتوں کی زندگیاں تباہ کرنے کے بجائے "بازارِ عصمت" کے علانیہ خریدار نہیں بنتے۔ لیکن اس کے جواب میں وہ اس کے سوا اور کچھ نہ کہہ سکے کہ وہاں جانا زیادہ معیوب ہے۔ حالانکہ اُن کے اس طرزِ عمل کی توجیہہ اس کے سوا اور کچھ نہیں کی جاسکتی کہ اس طرح وہ سینکڑوں مکر و دغل کے ساتھ اپنے شکار کو کم سے کم قیمت پر حاصل کر سکتے ہیں لیکن دوسری صورت میں اُنھیں اس کی پوری پوری قیمت ادا کرنا ہوتی ہے۔

پھر اگر ہماری بیویوں میں اتنی صلاحیت پیدا ہو جائے کہ وہ "مرد و عورت کے اتصال" کی تمام اغراض کی تکمیل بوجہ احسن کر سکیں تو مطربہ کے وجود کی اہمیت خود بخود فنا ہو جائے، اور یہ "پیشہ" اپنے آپ ختم ہو جائیگا۔ لیکن جب تک اس کا بازار گرم ہے اُس وقت تک یہ باور کرنے کی کوئی وجہ نہیں ہے کہ ہماری بیویوں نے "آلامِ حیات سے آسودگی" کے پہلو کو اپنا لیا ہے۔ کسی چیز کی "مانگ" اُس کی "ضرورت" کا ثبوت ہے۔ اور اس لئے جب تک مطربہ کے دروازہ پر موٹریں رُکتی رہینگی اُسوقت تک یہ تسلیم نہیں کیا جاسکتا کہ اس کی ضرورت ختم ہو گئی یا ہم اس کو قابلِ نفرت و حقارت سمجھنے میں حق بجانب ہیں۔

"آلامِ حیات سے آسودگی" کے دیگر ذرائع

یہاں یہ امر بھی ظاہر کر دینا ضروری ہے کہ "آلامِ حیات سے آسودگی" عکاس خانوں، تھیٹروں، دلچسپ کتابوں، ناولوں اور افسانوں میں بھی ممکن ہے۔ لیکن جو آسودگی ایک سیماب وش اور متبسم پیکرِ ناز کی معیت میں پائی جاتی ہے وہ کسی اور طرح حاصل نہیں ہو سکتی۔

موجودہ معاشرت میں مطربہ کی پوزیشن

اگر مطربہ کو ہماری زندگی سے علیحدہ کر لیا جائے تو اس کے یہ معنے ہوں گے کہ ہماری روح کو بدترین طور پر داغدار بنانے کی دعوت دی جا رہی ہے۔ ہماری اخلاقی دنیا کو بالکلیہ تیرہ و تار کیا جا رہا ہے۔ اور ایک بے کیف "جنسی اختلاط" کے علاوہ ہماری زندگی کی تمام رومانیت ہم سے چھینی جا رہی ہے۔ اور ہمیں اُن عورتوں کے چارج میں سونپا جا رہا ہے جو چند محدود و بے کیف باتوں کے علاوہ ہم سے گفتگو نہیں کر سکتیں۔ یقیناً جب تک عورت پردہ کے قفس کی "بے زبان" چڑیا ہے۔ جب تک اُس کے پرِ پرواز کی طاقتیں محرومِ پرواز ہیں۔ جب تک اُس کی ذہنی و دماغی سطح مرد کے مقابلہ میں بے انتہا

پست ہے۔ جب تک وہ فنونِ لطیفہ سے ناآشنا ہے۔ جب تک وہ قیام و قعود کے آداب سے ناواقف ہے۔ جب تک وہ انسانی جذبات کی نازک ترین لہروں سے نابلد ہے۔ جب تک وہ ظریف و لطیف گفتگو کرنیکے سلیقہ سے بے بہرہ ہے ——— اُسوقت تک صرف "مطربہ" کا وجود ہی ایک ایسا سرسبز جزیرہ ہے جو زندگی کے اس یک رنگ و یکساں (Monotonous) سمندر میں ہمارے سفر کی تعب انگیزی کو کافی حد تک خوشگوار بنا دیتا ہے۔

ورنہ دنیا میں پھر، کیا جائے ——— نکاح و عقیقہ؟

سید ابو سعید بزمی۔ ایم۔ اے

"نگار" جنوری ۳۶ء کے چند عنوانات ملاحظہ ہوں:۔

ہندی شاعری کا پہلا دور (رزمیہ شاعری) ہندی شاعری کی ابتدائی حالت۔ چندر بردائی۔ اور اس کے ہمعصر شعراء۔ جگ نائک۔ سارنگ دھر اور ہمیر کی شاعری۔ گورکھ ناتھ اور اس عہد کے دیگر شعراء معہ نمونۂ کلام اس عہد کے مختلف شعراء اور ان کا مختصر کلام۔ رزمیہ شاعری پر عام تبصرہ۔ جذبات و اسلوب بیان کے لحاظ سے۔
ہندی شاعری کا دوسرا دور:۔ (بھگتی تحریک) سوامی رامانند اور انکے پہلے کے بھگت شعراء۔ مقلدین رامانند۔ بھاؤنند رے داس بھگت۔ کبیر۔ گورو نانک دیو۔ میراں بائی۔ ملک محمد جائسی۔ تلسی داس۔ سور داس۔ عبدالرحیم خانخاں وغیرہ
ہندی شاعری کا تیسرا دور:۔ (بزمیہ شاعری کا آغاز) کیسو داس اور ہندی شاعری کا عروج۔ کیسو داس کے ہمعصر سندر داس سیناپت بابا دین۔ دیال گر۔ بھوشن۔ متی رام۔ چنتامنی۔ شاعر اعظم بہاری لال اور اسکی بزمیہ شاعری پر تبصرہ۔ گردھر کوی رائے اور ان کی کنڈلیاں۔ اس عہد کے بعض سنت شعراء اسی عہد کے بعض رزم گو شعراء ہندی شاعری کا عروج اور شاہان اسلام۔
ہندی شاعری کا دور چہارم:۔ (سنہ ۱۸۰۰ء کے بعد) للو لال۔ سدل مصر اور راجہ شیو پرشاد کی شاعری۔ موجودہ ہندی شاعری کے علمبردار۔ بھارتندو بابو ہرشچندر۔ پدماکر۔ بینی پردین۔ سری دھر پاٹھک کی شاعری شعراء حال اور ان کے کلام پر تبصرہ۔ ہندی شاعری پر اُردو کا اثر۔ ہندی کا اثر۔ ہندی دوہے یا اشعار ہندی رسم الخط میں بھی درج کئے جائیں گے اور اُردو رسم الخط میں بھی۔ ضخامت کا اندازہ ۲۰۰ صفحات کیا گیا ہے صرف اس ایک پرچہ کی قیمت ۸/ ہوگی۔ لیکن خریداران نگار سے علاوہ سالانہ چندہ کے اور کوئی رقم زائد نہیں لیجائے گی۔ منیجر نگار

دولت کی مساوی تقسیم

عام طور پر ہر شخص یہی سمجھتا ہے کہ غربت انسان کے لئے نہایت تکلیف دہ چیز ہے۔ اور ہر غریب انسان بہت بدقسمت ہوتا ہے۔ لیکن کسقدر عجیب بات ہے کہ غریب لوگ اس حالت میں بھی کہ وہ شدت کی بھوک اور مہلک سردی میں مبتلا ہیں، دوسرے لوگوں سے زیادہ مسرور نظر آتے ہیں۔ تم کو ایسے بہت سے آدمی نظر آئیں گے جو ساٹھ برس کی عمر میں چالیس سال پیشتر کی زندگی سے دس گنا زیادہ امیر ہیں۔ لیکن ان میں ایسا کوئی بھی نہ ہوگا جو یقینی طور پر کہہ سکے کہ وہ پہلے سے دس گنا زیادہ مسرور و مطمئن بھی ہے ---- تمام مفکرین عالم اس بات پر متفق ہیں کہ حصولِ مسرت مال و دولت پر منحصر نہیں ہے بلکہ نفسی کیفیات سے متعلق ہے۔ دولت بھوک کا علاج کر سکتی ہے لیکن غم و الم کو دور نہیں کر سکتی۔ ایک مشہور جرمن اشتراکی فرڈیننڈ لیسلے (Ferdinand Lassalle) کہتا ہے کہ غربا کو فلاکت و عسرت کے مقابل صف آرا کرنے کے لئے میری تمام کوششیں بیکار ثابت ہوئیں اور اس کی وجہ اُن کی "بے احتیاجی" تھی ---- بے احتیاجی کے معنی یہ نہیں کہ ان کو کسی چیز کی ضرورت ہی نہ تھی بلکہ اُن میں اسقدر تڑپ نہ تھی۔ کہ وہ مشکلات کا مقابلہ کرکے اپنی حالت میں کوئی تبدیلی پیدا کر لیتے۔ ایک غریب عورت عظیم الشان محل، درجنوں پوشاک، بے مثل خوبصورتی، اور حسین بالوں کی تمنائیں پال سکتی ہے لیکن ایک صاحب ثروت عورت جو ان تمام اسباب سے بہرور ہوتی ہے۔ کسی سنسان مقام پر رہ کر ان سے رہائی کی کوشش کرتی ہے۔ کیونکہ اس کے نزدیک گھنٹوں نہانے، دھونے، کنگھی چوٹی اور لباس تبدیل کرنے میں منہمک رہنا۔ اور ہر وقت خادماؤں سے گھرا رہنا نہایت تکلیف دہ ہے۔

ایک رند مے نوش، زاہد خشک سے زیادہ مسرور رہتا ہے اور یہی وجہ ہے کہ بہت سے لوگ اس عادتِ بد کا شکار ہو جاتے ہیں ---- بہت سی ایسی دوائیں ہیں جو نہایت کیف آور ہوتی ہیں۔ مگر اُنکا استعمال جسم و روح دونوں کے لئے تباہ کن ہے۔ الغرض مسرت کی جستجو دولت یا دیگر اسباب تفریح میں کرنا مفید نہیں ہے اور جب تک خود نفس میں کوئی کیفیت انبساط نہ پائی جائے تمام مادی ذرائع بیکار ہیں۔ موجودہ غربت وہ نہیں ہے جو پہاڑ والے وعظ میں نہایت مبارک بتائی گئی تھی بلکہ یہ غربت وہ غربت ہے جو ذلت و پستی

کی علمبردار ہے، جو غریبوں کو ذلیل کرتی ہے - ان کو حقیر بتاتی ہے ورنہ یوں تو غریب اپنی غربت میں بھی اتنا ہی خوش رہ سکتے ہیں - جتنا امیر لوگ اپنی نشاط سامانیوں میں -

حقیقت یہ ہے کہ موجودہ غربت جو ہر شہر و قصبہ میں پائی جاتی ہے - لوگوں کو پستی کی طرف ڈھکیل رہی ہے اور اس طرح تمام ماحول کو مسموم کر رہی ہے اور اپنا حلقۂ اثر وسیع کر کے براعظم بلکہ تمام مہذب دنیا میں نفوذ کر جاتی ہے جب متعدی اور مہلک امراض آغوشِ غربت میں پرورش پاتے ہیں - تو امرا اور اُن کے بچے بھی ان میں مبتلا ہو کر مرتے ہیں - اور جب ناداری و مفلسی جرائم کا باعث ہوتی ہے تو امراء ہی ان سے زیادہ خوفزدہ ہوتے ہیں اور جب فلاکت زدہ - خوبصورت عورتیں کسب روزی کے لئے ناجائز ذرائع اختیار کرتی ہیں - تو امیر زادے اُن کی صحبت سے متاثر ہو کر اپنی بیویوں اور بچوں کو مبتلائے امراض کر دیتے ہیں - جو بعض اوقات بدہیئتی، بے بصری اور موت کا باعث ہوتے ہیں -

یہ فرسودہ خیال کہ ہم اپنی دنیا صرف اپنے ہی تک محدود کر لیں یہاں تک کہ قرب و جوار سے بھی غیر متعلق ہو جائیں ایک خطرناک غلطی ہے - یہ ضرب المثل کہ ہم سب ایک ہی درخت کی شاخیں ہیں - صرف مقدس گرجاؤں ہی میں (بے سوچے سمجھے) پڑھے جانے کے لئے نہیں ہے بلکہ یہ ایک زندہ حقیقت ہے جسے ہر شخص کو سمجھنا چاہئے ممکن ہے کسی شہر کے امراء وہاں کے غریب لوگوں سے بچ کر بستی سے دور رہنا اختیار کریں مگر اُن مہلک امراض سے جاں بر نہیں ہو سکتے جو غریب آبادی کی غربت کی وجہ سے پیدا ہوتے ہیں -

لوگ ایک محدود دائرۂ حیات میں رہ کر زندگی بسر کر سکتے ہیں - مگر صرف اسی طرح کہ غربت کا استیصال کر دیا جائے - ورنہ جب تک یہ باقی ہے، اُسوقت تک یہ ناممکن ہے کہ امرا مفلسی کے دردناک مصائب، غریبوں کی کرب انگیز چیخ پکار، اور اُس کے اثرات بد کی طرف سے آنکھیں بند کر لیں - یا مطمئن ہو جائیں کہ اس کا خوفناک حملہ اُن پر اثر انداز نہ ہوگا - علاوہ ازیں جب تک غربت دنیا میں موجود ہے، ہم قطعی و حتمی طور پر یقین نہیں کر سکتے کہ اس کی جاں گداز گرفت سے آزاد ہیں ؟ - اگر ہم دوسروں کے لئے غار کھود دیں گے تو ممکن ہے ہم ہی پہلے اس میں جا گریں - اور اگر ہم کسی خطرناک نشیب کو بغیر حفاظتی تدابیر کے کھلا چھوڑ دیں تو بعید از قیاس نہیں کہ ہمارے ہی بچے، کھیلتے کھیلتے اس میں جا گریں -

ایک بیکار و مفلس آدمی کی بابت یہ کہہ دینا نہایت آسان ہے کہ غربت اس کے لئے تازیانہ ہے اور یہ کہ اسے غریب ہی رہنے دو - کیونکہ اس کے لئے یہی بہتر ہے - لیکن اس خیال کی اشاعت سے قبل یہ سوچ لینا ضروری ہے کہ مفلس و بیکار آبادی کی مصیبت نہایت وسیع الاثر چیز ہے اور اس سے امراء کا طبقہ بھی متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا -

لہٰذا معقول و مناسب تقسیم دولت کے لئے یہ نہایت ضروری ہے کہ ہر شخص کو اتنا حصہ ملنا چاہئے جو غربت و ناداری سے اُس کو محفوظ رکھ سکے۔ تقسیم دولت کی یہ صورت کوئی نئی بات نہیں ہے بلکہ ملکہ الزبتھ کے زمانہ حکومت سے انگلستان کا قانون ہے کہ کوئی متنفس اس بے چارگی کا شکار نہ ہونے دیا جائے۔ مگر افسوس ہے کہ اس قانون کا استعمال صحیح طور پر نہیں ہوتا اور بسا اوقات ایسی نامعقول شرطیں لگا دیجاتی ہیں کہ ایک غریب مگر شریف الخیال شخص اس قانون سے فائدہ نہیں اُٹھا سکتا۔

اب ہم ایک ملک کو بڑا گھرانا تصور کرتے ہیں۔ اور تمام قوم کو خاندانی افراد۔ اچھا اس خاندان کا بنظر غور مطالعہ کرنا چاہئے۔ ہماری نظر بھوکے، ننگے اور خانماں برباد بچوں پر پڑتی ہے۔ وہ تمام روپیہ جو ان کا پیٹ بھرنے، تن ڈھانکنے اور سر چھپانے پر خرچ ہونا چاہئے تھا۔ وہ عطریات، زیورات، تفریحی و نمائشی کتوں۔ قیمتی موٹروں اور اسی قسم کی بہت سی فضول چیزوں پر صرف ہوتا ہے ۔۔۔ اسی گھرانے میں ایک بہن کے پاس پھٹے کپڑے بھی نہیں کہ سردی سے محفوظ رکھ سکیں، اُس کے پاس غلاظت صاف کرنے کے لئے ایک پھٹا معمولی کپڑے کا رومال تک نہیں۔ مگر دوسری بہن کے پاس بکثرت قیمتی جوڑے اور درجنوں ریشمی رومال ہیں، ایک پراگندہ حال معصوم بچہ روٹی کے ایک خشک ٹکڑے سے بھوکے پیٹ کی تسکین کرنا چاہتا ہے مگر بے حال ہو کر اپنی دُکھی ماں ۔ نان و شبینہ سے محروم ماں، کے دامن کو کھینچتا ہے کہ وہ اُس کا پیٹ بھر دے۔ یہ تحمل فرسا نظارہ ماں کا دل توڑ دیتا ہے۔ مگر اُسی قوم کا دوسرا فرد کسی عالی شان ہوٹل میں جا کر بیسیوں روپئے صرف ایک کھانے پر صرف کر دیتا ہے۔ اور پھر کسی کلب میں جا کر داد عیش دیتا ہے۔ آپ دیکھتے ہیں کہ یہ طرزِ زندگی کسقدر دل شکن اور حوصلہ فرسا ہے۔ اور جب کسی شخص سے پوچھا جاتا ہے کہ یہ ایسا کیوں ہے۔ تو وہ جواب دیتا ہے۔ وہ چالیس جوڑے رکھنے والی عورت اور ہوٹلوں میں مسرتانہ زندگی بسر کرنے والا آدمی دونوں صاحب ثروت والدین کی اولاد ہیں۔ اور ٹوٹے جوتے والی لڑکی اور بھوک سے بلبلانے والا بچہ دونوں نہایت ذلیل اور پست خاندان سے تعلق رکھتے ہیں۔" یہ سب کچھ صحیح ہے لیکن اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ وہ قوم جو بھوکے بچوں کو دودھ پلانے کے بجائے اُمرا کی بادہ خواریوں پر روپیہ ضائع کرتی ہے اور وہ قوم جو لذیذ و بیش قیمت کھانوں سے نمائشی کتوں کی پرورش کرتی ہے۔ اور یہ نہیں دیکھتی کہ چھوٹے چھوٹے انسانی بچے پیٹ بھر کھانا نصیب نہ ہونے کے باعث مر رہے ہیں یقیناً نہایت جاہل قوم ہے اور اس کے نصیب میں یقینی موت اور ہلاکت ہے۔

سوسائٹی کے یہ نقائص صرف دولت کی غیر مساوی تقسیم سے از خود پیدا ہو جاتے ہیں۔ ایک امیر آدمی بھی روٹی۔ کپڑا۔ مکان خریدنے کی ضرورت رکھتا ہے۔ اور ایک غریب آدمی کو بھی یہ سب کچھ کرنا پڑتا ہے۔ لیکن جب غریب آدمی اپنی ایک ایک پائی تک ان ضروریات پر صرف کر دیتا ہے۔ تو اُسوقت بھی اُس کو شکایت رہتی ہے

کہ کھانا ناکافی ہے، کپڑے میلے ہیں، اور مکان تنگ ہے۔ اس کے برعکس امیر کے پاس لذیذ کھانے، مکلف کپڑے اور عالی شان مکان حاصل کر لینے کے بعد بھی اس قدر دولت بچ رہتی ہے کہ شراب و کباب میں صرف کرے۔ پھر صورت یہ پیدا ہوتی ہے کہ ایک طرف غریب کی یہ غم آلود چیخ سنائی دیتی ہے کہ مجھے پیٹ بھرنے کو روٹی اور تن ڈھانکنے کو کپڑا چاہئے اور دوسری طرف عیش و عشرت میں کھیلنے والا امیر کہتا ہے کہ مجھے استنے موٹر چاہئے ایک ہلکا، سبک رفتار، تفریحی جہاز چاہئے، میری بیوی کے لئے موتی اور ہیرے چاہئے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ کاروباری لوگ موٹر کار اور جہاز بنانے میں مصروف ہو جاتے ہیں، افریقہ کی کانوں سے مہینوں کی کوہ کنی کے بعد جواہرات لائے جاتے ہیں، اور موتیوں کے لئے سمندر کھنگالے جاتے ہیں۔ مگر غریب اور اُسکی چیخ و پکار کی طرف کوئی بھی توجہ نہیں کرتا۔ یہ درست ہے کہ امیروں کی ان خواہشوں کی وجہ سے مزدوروں کو کام کرنے کا موقع میسر آجاتا ہے لیکن سوال یہ ہے کہ مزدوروں ہی کو اس دولت میں سے کیا ملجاتا ہے۔

یہ کہنا کہ امیروں کی دولت بے کاروں کے لئے کام کاج مہیا کرتی ہے۔ قابلِ پذیر عذر نہیں ہے۔ کام کا مہیا کرنا کوئی قابلِ تعریف کام نہیں۔ ایک خونخوار قاتل بھی، پھانسی دینے والے کے لئے وجہ معاش ہے اور ایک موٹر ڈرائیور جو کسی کو اپنے موٹر سے کچل دے وہ بھی ایک ڈاکٹر، ایک کفن دوز، ایک پادری۔ ایک ماتمی لباس بنانے والے کو کام پر لگا دیتا ہے لیکن کیا ایسا کام پر لگنا کوئی قابلِ تعریف بات ہے۔

وہ تمام روپیہ جو یوں غیر ضروری مدوں میں صرف ہوتا ہے مساوی تقسیم دولت کے بعد صحیح اور جائز ضرورتوں میں کام آسکتا ہے۔ کیونکہ اُس وقت اتنا فالتو روپیہ نہیں ہوگا کہ موٹر کاریں اور جواہرات خریدے جائیں۔ اُس وقت بھوکوں کا پیٹ بھرنا، ننگوں کا تن ڈھانکنا اور خانماں بربادوں کا سر چھپانا فرضِ اولین سمجھا جائے گا۔

اُس وقت نمود و نمائش مٹ جائے گی۔ بے کاری جاتی رہے گی۔ خسران و نقصان فنا ہو جائیں گے اور دنیا میں زیادہ امن و سکون نظر آئے گا۔ مساویانہ طور پر تقسیم دولت ناممکن العمل چیز نہیں ہے بلکہ ایک عرصہ مدید کی آزمودہ چیز ہے۔ متمدن دنیا کے بہت سے کام ہمیشہ سے اسی اشتراکی اسلوب کے مطابق کئے جاتے ہیں اور کئے جایا کریں گے۔ اس طریقہ کار میں چھوٹے، بڑے، کالے، گورے، جوان اور بوڑھے، کنوارے اور بیاہے کی تقسیم و تمیز نہیں ہے۔ ایک پیشے میں طے شدہ اُجرت ہے اور ہر کام کے لئے مقررہ مزدوری ایک سپاہی اور ہرکارے کی تنخواہ، ایک مزدور اور معمار کی مزدوری، ایک جج اور پارلیمنٹ کے ایک رکن کی تنخواہیں مختلف ہو سکتی ہیں۔ کوئی ان میں سے سو پاؤنڈ سالانہ پاتا ہے اور کوئی پانچ ہزار مگر ہر سپاہی، ہر جج اور ہر ایک رکن کی تنخواہ مساوی و برابر ہوگی۔ اُن میں کسی قسم کا اختلاف ناممکن ہے۔ اگر کسی ڈاکٹر سے

پوچھا جائے کہ اُس کی فیس معائنہ پانچ روپیہ کیوں مقرر ہے وہ دس روپیہ کیوں نہیں لیتا۔ تو غالباً اُسکے پاس اس سے بہتر اور کوئی جواب نہیں ہوسکتا کہ میں وہی فیس لیتا ہوں جو دوسرے میرے ہم پیشہ ڈاکٹر لیتے ہیں۔

اگر کوئی شخص یہ کہے کہ اگر ہر شخص کو مساوی حصۂ دولت دیا جائے۔ تو کچھ عرصہ کے بعد، پہلے کی طرح پھر امیر و غریب کی تفریق پیدا ہو جائے گی۔ اُس کو اُن ہزاروں، لاکھوں انسانوں کی مثالیں بتائی جائیں جو مساوی ز مقررہ تنخواہیں پاتے ہیں۔ اور اپنی تمام زندگی اُسی یکسانی ہے مساوات کے ساتھ بخیر و خوبی گزار دیتے ہیں۔ اور کوئی انقلاب انگیز بات پیش نہیں آتی۔ وہ حالات جن میں کوئی غریب آدمی، امیر ہو جائے، استثنائی واقعات ہیں اور امیروں کا غریب ہو جانا بھی محض اتفاقات پر مبنی ہے۔ عام روش یہ ہے کہ ہم پیشہ و ہم مشرب لوگوں کو مساوی و مقررہ تنخواہ ملتی ہے۔ اور وہ اتنی میں ایک ہی طرح سے زندگی بسر کرتے ہیں۔ اُن میں نہ کوئی غریب تر ہو جاتا ہے اور نہ زیادہ امیر بن جاتا ہے۔

ہمیں صرف یہ کرنا ہے کہ ایک پوسٹ مین کو۔ پوسٹ ماسٹر کے برابر تنخواہ ملا کرے اور پوسٹ ماسٹر کو دوسرے کارکنوں کے برابر۔ جب ہم جانتے ہیں کہ ایک جج کو، بحری کپتان کے برابر تنخواہ دینے سے ہمارا مقصد زیست پورا ہو جاتا ہے۔ تو یہ کیوں کیا جائے۔ کہ ایک جج، بحری کپتان سے پانچ گنا زیادہ روپیہ لے۔ اور اگر کپتان اس بیجا تفریق کا سبب دریافت کرے اور تم اس سے کہو کہ جج کے برابر تنخواہ لینے سے بھی تم سال کے آخر میں حسبِ سابق غریب ہو جاؤ گے۔ تو وہ یقیناً ایسے درشت و کروہ الفاظ میں جواب دیگا کہ تم سُننے کی تاب لا سکو گے لہذا اشتراکی یا مساوی تقسیمِ دولت کے متعلق ایسی پوچ۔ لغو اور بے سر و پا باتیں کرنے سے پرہیز کرنا چاہئے تقسیمِ دولت کا یہ طریقہ نہایت سادہ اور سریع الفہم ہے۔ یہ صرف عارضی طور پر نہیں بلکہ مستقلاً عمل میں لایا جا سکتا ہے۔

(شا) ا ۔ ج

مجموعۂ استفسار و جواب جلد دوم

کی

طباعت ختم کے قریب ہے

عورت کی منطق

جب وہ جنگ کے لئے آمادہ ہو جائے

لیڈی ڈرامونڈ انگلستان کی مشہور صحافت داں خاتون ہیں اور ٹھیک اسوقت جبکہ ساری دنیا امن سکون کے لئے بیتاب ہے، وہ جنگ ہی کو انسانیت کے لئے مفید بتاتی ہیں اور اس میں شک نہیں کہ ان کی اس منطق کے سامنے مشکل ہی سے کسی کو یارائے گفتگو ہو سکتا ہے۔ وہ لکھتی ہیں کہ:۔

انسانیت کے لئے جنگ امن وسکون سے زیادہ حریت نواز ہے کبھی ایسا نہیں ہوا کہ جنگ نے کسی قوم کی روح کو فنا کیا ہو یا اس کے اخلاق کو تباہ کر کے برباد کر دیا ہو بلکہ یہ برکت صرف عشرت و تنعم کی ہے جو جمود و تعطل پیدا کر کے قوموں کو ہلاک کر دیتی ہے، روما کی ہلاکت کا سبب جنگ نہیں بلکہ عیش و تنعم تھا جو افراد قوم کی رگ رگ میں سرایت کر گیا تھا اور جس نے آخر کار اسے ایک بے حس و بیکار قوم بنا کر چھوڑ دیا، آج تک انسانیت نے جو ترقی حاصل کی ہے، خواہ وہ ترقی مادی ہو یا اخلاقی مرہون ہے صرف جنگ کی، جنگ نوع انسانی کے جسم پر ایک عمل جراحی ہے جس کے بعد اس میں زیادہ قوت حیات پیدا ہو جاتی ہے، چنانچہ تاریخ اٹھا کر دیکھو کہ ایک قوم کا حال جنگ سے پہلے کیا تھا اور جنگ کے بعد اس کے قوائے عمل میں کتنا تغیر پیدا ہو گیا۔ روحانی ترقی کا بھی یہی حال ہے کہ جب تک خواہشات سے جنگ نہ کیجائے حاصل نہیں ہو سکتی۔

سرہاری مالٹ اور میجر باردی کا قول ہے کہ: "جنگ اشکال ریاضی کی ایک ترقی یافتہ شکل ہے" چنانچہ گزشتہ جنگ عظیم کو دیکھئے کہ اس کی حقیقت کیا تھی۔ وہ صرف علم کی لڑائی تھی، ریاضی کی جنگ تھی اور آخر کار وہی کامیاب ہوا جو زیادہ ریاضی داں اور زیادہ صاحب علم ثابت ہوا۔ گزشتہ زمانہ میں بھی جنگ ریاضی کے کھیل کی حیثیت رکھتی تھی۔ بلوتارخ نے ایک جگہ لکھا ہے کہ ارشیدموس نے جب سب سے پہلے تیر کو دیکھا جو صقلیہ سے لایا گیا تھا تو یکایک اس کے منہ سے یہ چیخ نکل گئی کہ "یا خدا! کیا اب یہی شجاعت ہمیشہ کے لئے رخصت ہو جائیگی" اس زمانہ کی جنگیں بھی وہی ریاضی کا کھیل ہیں لیکن زیادہ دقیق، زیادہ عسیر الفہم اور جس طرح ارشیدموس

نے سب سے پہلا تیر دیکھ کر حیرت کی تھی، اسی طرح اب بھی بعض غیر ریاضی داں دماغ ان کو شجاعت کے منافی سمجھتے ہیں۔ جنگ کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ زمانۂ قدیم سے لیکر آج تک، تاریخ کی بنیاد ہمیشہ اسی پر قائم ہوئی ہے وہ ایک نغمہ ہے جسے ہر زمانہ میں ہر جگہ انسان گاتا ہے۔ وہ لوگ جو دنیا سے جنگ کو مٹا دینا چاہتے ہیں وہ گویا یہ چاہتے ہیں کہ دنیا صدیوں پیچھے ہٹ جائے کیونکہ دنیا اب اس کے لئے طیار نہیں ہے کہ مسیح دوبارہ تشریف لاکر اس کو امن و سکون کا وعظ دیں۔ کیا دُنیا میں بغیر تکلیف و مصیبت برداشت کئے ہوئے کوئی نعمت حاصل ہو سکتی ہے۔ تمام اہل مذاہب کا اعتقاد ہے کہ جب تک تکالیف جسمانی برداشت نہ کی جائیں روحانی و اخلاقی ترقی حاصل نہیں ہو سکتی۔ پھر ہم کیونکر توقع رکھ سکتے ہیں کہ مجمع انسانی جمود و بے حسی کے عالم میں مسرت و سعادت سے ہمکنار ہو سکتا ہے اور بغیر کسی ایسی چیز کے جو اسے آگے بڑھنے پر اُبھارے وہ ترقی کے زینہ پر قدم رکھ سکتا ہے۔ پھر یہ اُبھارنے والی چیز کیا ہے ؟ جنگ اور صرف جنگ۔ یونانیوں کا خیال تھا کہ سلطنت فارس ناقابل تسخیر ہے لیکن جب ۴۹۰ء قبل مسیح میں انھوں نے فارس سے جنگ کی تو معلوم ہوا کہ یہ خیال غلط تھا اور آخرکار اسی کامیابی نے یونان کو علوم و فنون کا مخزن اور موجودہ تہذیب یوروپ کا گہوارہ بنادیا۔ پھر جب تک یہ جنگجویانہ عہد اسپارٹا قائم رہا، یونان کی برتری بھی قائم رہی اور جب وہ عیش و راحت میں پڑ گیا تو فنا ہوگیا۔

اب خود اہلِ برطانیہ کی ترقی کی تاریخ پر نظر ڈالئے کہ اس کی ابتدا کب ہوئی۔ پھر کیا اس سے انکار ممکن ہے کہ اگر ۵۵ء (ق۔م) اہلِ روما اُن سے جنگ نہ کرتے تو وہ بدستور وحشی بنے رہتے۔ اس سے قبل یہ بالکل جاہل و غیر مہذب تھے، انھیں تمدن کی ہوا تک نہ لگی تھی مگر جب اہل روما داخل ہوئے تو انھوں نے انھیں مہذب بنایا اور موجودہ تمدن سے روشناس کیا۔ انھوں نے انواع و اقسام کے درخت لگائے، جھاڑیوں وغیرہ کو کاٹ کر زمین کو کاشت کے قابل بنایا۔ ایسے مقامات کا پتہ چلایا جہاں معدنیات پائی جاتی ہیں چنانچہ ڈین کے جنگل سے لوہا نکلا، کورنوال کی معدن سے ٹین دستیاب ہوا، مونٹگومری سے تانبہ اور سیسہ برآمد ہوا۔ اور شروپشیر سے کوئلہ۔ علاوہ اس کے پچاس قلعہ بند شہر طیار کئے جن میں سے ایک لندن بھی تھا۔

اس کے بعد جب ۱۰۶۶ء میں نارمنڈیوں نے جنگ کی تو ترقی و آزادی کی طرف دوسرا قدم اُٹھایا اور میگنا چارٹا حاصل کیا جو دستور آزادی کی پہلی بنیاد تھا۔ پھر جب داخلی جنگوں کا سلسلہ شروع ہوا تو اسکا نتیجہ یہ ہوا کہ ۱۴۸۵ء میں ہنری سابع (ٹھیوڈر خاندان کا پہلا فرمانروا) تخت نشین ہوا اور اس طرح گویا سب سے پہلے ڈیمقراطی حکومت کی بنیاد پڑی اور بحری قوت کی تعمیر شروع ہوئی۔ اس کے بعد فرانس کے لوئیس چہاردہم اور انگلستان کے فرمانروا ولیم ثالث سے جنگ ہوئی جس میں فرانس کے خلاف ہالینڈ اور اسپین بھی

انگلستان کے شریک تھے۔ اور اس کا نتیجہ بھی اہلِ تاریخ سے مخفی نہیں کہ اگر لوئیس کے خلاف یہ جنگ نہ کیجاتی تو پروٹسٹنٹ مذہب فنا ہو جاتا اور تمام مغربی یوروپ پر فرانسیسی استبداد کی حکومت قائم ہو جاتی۔

اسی کے ساتھ اس جنگ کو دیکھئے جو فرانس اور پروشیا کے درمیان ستر سال تک جاری رہی کہ جدید جرمن حکومت کی بنیاد اسی کی وجہ سے پڑی اور پاپائے روم کو جو دینوی اقتدار حاصل تھا وہ بھی اسی سلسلۂ جنگ کی وجہ سے محو ہوا۔

اب جاپان کی جنگوں کو دیکھئے جو اس نے چین اور روس سے کیں کہ اگر چین کو ہزیمت نہ ہوتی تو وہ قیامت تک خواب عظمت سے نہ چونکتا اور اگر روس کو شکست نہ ہوتی تو استبداد قیصری شاید اب بھی وہاں قائم رہتا۔

اب رہی گزشتہ جنگ عظیم، سو اس کے فوائد سے کس کو انکار ہو سکتا ہے۔ ہوائی جہازوں کی تعمیر میں غیر معمولی ترقی، جدید آلات حرب کے سلسلہ میں میکانکی اکتشافات، مدافعت کے عجیب و غریب علمی ذرائع افواج کی جدید تنظیم، بحری جہازوں کی تعمیر میں غیر معمولی جدتیں، طرح طرح کی گیسوں کی ایجاد، قلعہ بندی و تحفظ کی نئی نئی تدبیریں، الغرض ریاضی، سائنس اور کیمیا کا کونسا چھپا ہوا راز ایسا تھا جو اس جنگ کی بدولت ظاہر نہیں ہوا اور ان اکتشافات کے بدولت وہ کونسا شعبۂ تمدن ہے جو متاثر نہ ہوا ہو۔

بہار

مولفۂ الیاس احمد ایم۔اے۔ایل۔ایل۔بی منصف سہارنپور

گلدستہ "بہار" فارسی اور اردو شعراء کے چوٹی کے کلام خصوصاً غزلوں کا بہترین اور نایاب مجموعہ ہے۔ یا یوں سمجھئے کہ "درزبان شاعراں" حسن و شوق کی مکمل داستان ہے اس داستان کے "آغاز عشق" سے لیکر "انجام عشق" تک جتنے عنوانات قائم ہو سکتے ہیں قائم کئے گئے ہیں اور ہر عنوان کے تحت میں چیدہ چیدہ متحد المضامین اشعار درج ہیں۔ عنوانات سینکڑوں ہیں۔ اس گلدستہ کے ہوتے ہوئے شاید ہی کسی دیوان کی ضرورت ہو علم و ادب میں یہ گلدستہ ایک دلکش اور دلفریب اضافہ ہے۔ کتاب دیکھنے سے تعلق رکھتی ہے۔ شنیدہ کے بود مانند دیدہ۔ اہل ذوق ملاحظہ فرمائیں۔ قیمت معہ محصولڈاک عہ ضخامت ۲۳۲ صفحات

ملنے کا پتہ:۔ مینجر صاحب دار المصنفین اعظم گڈھ۔ یو پی

بخوم کے بعض تاریخی وعلمی مباحث

اور

قصاید خاقانی میں منجمانہ اشارات

ایک مدت سے کلیات خاقانی کا ایک قلمی نسخہ میرے پاس محفوظ ہے اس میں خاقانی کے قصائد مراثی مندرج ہیں یعنی کلیات کا یہ پہلا حصہ ہے اہل نظر جانتے ہیں کہ خاقانی نے اپنا سارا سرمایۂ خیال اور زور قلم قصاید پر صرف کیا ہے اس میں شک نہیں اس کے یہاں عرفی کی طرح شاعرانہ حلاوت و شگفتگی نہیں پائی جاتی اسی لئے اس کے قصاید عوام میں قصاید عرفی کی طرح مشہور و دلپسند نہیں خاقانی کی دقت پسندیوں نے اسکو تغزل کے میدان میں تو بالکل مجہول بنا دیا یہاں تک کہ اس کی غزلیات کا اتنا بڑا مجموعہ اپنی بے نمکی کے باعث ایک دفتر بے معنی سمجھا جاتا ہے، رہگیا مجموعہ قصاید تو اس میں بھی عوام کے لئے سامان تفریح نہیں ہاں جو لوگ ادب عالیہ اور انشائے لطیف پر نقادانہ نظر رکھتے ہیں وہ اچھی طرح عرفی اور خاقانی کے قصاید کا فرق و امتیاز سمجھ سکتے ہیں عرفی کی نزاکت تخیل، معنی آفرینی اور روانی بیان مسلم ہے، خاقانی کے یہاں بھی یہ سبھکچھ ہے لیکن تلمیحات نے اس کے کلام کو ادق بنا دیا وہ جس آزادی کے ساتھ قرآن و حدیث، تفسیر و فقہ، تاریخ و سیر، ریاضی و حکمت، فلسفہ و تصوف، نجوم و ہیئت کے مسائل کی طرف اپنے قصاید میں اشارے کرتا ہے وہ اسقدر بلند سطح کی چیزیں ہیں کہ فکر عامہ کی وہاں تک رسائی نہیں اگر مجھ سے سوال کیا جائے کہ فارسی شعراء میں ملٹن کا کوئی مقابل ہے تو میں فوراً خاقانی کا نام لے لونگا ملٹن کی "فردوس مفقود" (Paradise Lost) کا ایک سرسری جائزہ لیجئے اور اس کے بعد قصاید خاقانی پر ایک نظر ڈالئے آپ فوراً اس نتیجہ پر پہونچ جائینگے کہ ملٹن اور خاقانی کی بدیعہ انشا اور اسلوب تحریر میں ایک خاص قسم کی مماثلت پائی جاتی ہے۔[1]

---

[1] ایور کرامول (Oliver Cromwell) کا زمانہ ہے انگلستان میں جمہوریت قائم ہو چکی ہے ۹۴ء

اوراق ہذا میں قصاید خاقانی کے اس حصہ سے بحث کی جائیگی، جس میں شاعر نے منجمانہ اشارات کئے ہیں لیکن قبل اس کے کہ اس مسئلہ پر گفتگو کیجائے نجوم کے بعض تاریخی شواہد اور علمی نکات پر روشنی ڈالنا ازبس ضروری ہے۔

میرا یہ مضمون جیسا کہ عنوان سے ظاہر ہے تین حصوں پر منقسم ہے پہلے حصہ میں نجوم کے متعلق تاریخی وعلمی مباحث ہوں گے، دوسرے حصہ میں خاقانی کے سوانح حیات سے بحث کی جائے گی اور تیسرے حصہ میں اس کے قصاید کے ان ابیات کی شرح وبسط ہوگی جن میں شاعر نے منجمانہ نکتہ سنجیاں کی ہیں۔

احکام نجوم کے متعلق تاریخ میں بہت سے دلچسپ اور معتبر واقعات نظر آتے ہیں یہاں تک کہ حدیث اور اسماء الرجال میں بھی جستہ جستہ اس کا تذکرہ آجاتا ہے امام بخاری نے ہرقل کے متعلق ایک طویل حدیث روایت کی ہے، اس میں آنحضرت صلعم کے اس خط کی نقل کی ہے جو آپ نے ۶ھ میں دحیہ کلبی کے ہاتھ بصریٰ کے حاکم کو بھیجا تھا (اور اس نے وہ خط ہرقل کو بھیجدیا) اور جس میں ابوسفیان اور قریش سے پیغمبر صلعم کے متعلق ہرقل کے سوال وجواب کی تفصیل پائی جاتی ہے اسی حدیث میں ضمناً بخاری نے یہ بھی لکھا ہے:۔

قال ابن الناطور کان ہرقل حزاءً ینظر فی النجوم فقال لہم حین سألوہ انی رأیت اللیلۃ حین نظرت فی النجوم ملک الختان قد ظہر[1]

ابن ناطور نے کہا ہرقل ستارہ شناس تھا لوگوں نے اس سے سوال کیا تو اس نے کہا کہ رات کے وقت جبکہ میں نے ستاروں کو دیکھا تو پتہ چلا کہ ختنہ کرنے والوں کا بادشاہ غالب ہوا

ابن ناطور ایلیا کا حاکم ہرقل کا مصاحب اور شام کے نصاریٰ کا بیرپادری تھا اس نے بتایا کہ

صح۔ ۱۶۵۳ء سے ۱۶۵۸ء تک کرامول کا اقتدار رہا اس عہد میں ملٹن کی شخصیت بھی تاریخ میں نمایاں حیثیت رکھتی ہے چنانچہ کرامول کی سیاسی کامرانیاں بہت کچھ ملٹن کی عالمانہ سعی کی منت پذیر ہیں، وہ لاطینی زبان کا ماہر اور "معتمد خارجہ" (Foreign Secretary) کے عہدہ پر فائز تھا اجنبی ممالک ودول سے خط وکتابت لاطینی زبان میں ہوتی تھی، عہد حاضر میں ترکی کے اندر مصطفےٰ کمال اور عصمت پاشا کی جو شخصیتیں ہیں وہی حالت الیور کرامول اور ملٹن کی تھی، فرق صرف یہ ہے کہ ملٹن ایک بلند پایہ شاعر بھی تھا اور عصمت پاشا صرف ایک سیاسی مدبر اور علامہ ہیں ہاں بحث یہ تھی کہ ملٹن لاطینی زبان کا ماہر تھا "خلد گم شد" کا ہر صفحہ اس کے ذوق لاطینی کا آئینہ دار ہے۔ خاقانی نے جس آزادی اور بے تکلفی کے ساتھ اسلامیات اور خرافیات کے اشارے کئے ہیں اسی طرح ملٹن یونانی اوہام واساطیر اور لاطینی قصص وروایات کی طرف اشارے کرتا ہے۔

[1] بخاری (کیف بدء الوحی)

یہودیوں کے سوا کوئی ختنہ نہیں کرتا اس کو خبر نہ تھی کہ مسلمان بھی ختنہ کرتے ہیں اور یہی ہوا کہ مسلمان رومی سلطنت پر قابض ہوگئے۔

اسی طرح حضرت ابن حبان محدث (متوفی ۳۵۴ھ) کے متعلق لکھا ہے کہ:۔

سوائے علم حدیث علوم دیگر ہم داشت، فقہ ولغت وطب ونجوم رانیک می دانست[1]

قرون اولیٰ میں طب کے ساتھ نجوم کو خاص تعلق تھا چنانچہ اطبا نجوم کی بھی باضابطہ تعلیم حاصل کرتے تھے، ڈاکٹر ڈی بوئر لکھتا ہے:۔

> نویں صدی میں جدید ہیئت اجتماعیہ چاہتی تھی کہ اطبار فلسفہ کے بھی حامل ہوں ان کو غذا کی ماہیت، مزاج جسمانی کا علم بھی حاصل کرنا ضروری تھا، اور ہر حالت میں اثر کواکب کی واقفیت لازمی تھی، طبیب منجم کا بھائی تھا، اور اس کی عزت کرتا کیونکہ علم نجوم طبابت سے کہیں زیادہ بلند مقصد رکھتا ہے[2]

احکام نجوم کی تصدیق کے سلسلہ میں معتبر مورخین نے بہت سی روایتیں درج کی ہیں ان میں ابو شجاع بویہ دیلمی ابوریحان بیرونی، الحاکم بامر اللہ فاطمی، المعز الدین اللہ اسمٰعیلی، حسن گانگوی بہمنی کے عہد کی منجمانہ پیشین گوئیاں بہت دلچسپ ہیں۔

ابو شجاع بویہ دیلمی

چوتھی صدی کے آغاز سے پانچویں صدی کے وسط تک دیالمہ کی حکومت رہی ابو شجاع نے ایک رات خواب میں دیکھا کہ بہت سخت آگ لگی ہے اور پھیل کر بعض شہروں پر چھا رہی ہے یہاں تک کہ اس کی روشنی آسمان تک پہونچی، اس کے بعد یہ آگ تین حصوں میں تقسیم ہوگئی، اور شہروں اور انسانوں کو دیکھا کہ آگ کے ان حصوں کے حضور میں سجدہ کر رہے ہیں اس عرصہ میں بویہ سے ایک منجم ومعبر کی ملاقات ہوگئی بویہ نے اپنا خواب بیان کیا منجم نے کہا یہ بہت بڑا خواب ہے اس کی تعبیر اس شرط پر بتاؤں گا کہ مجھے گھوڑا اور کپڑا انعام دو، بویہ نے کہا، خدا کی قسم سوائے اس کپڑے کے جو پہنے ہوئے ہوں میرے پاس دوسرا کپڑا نہیں ہے منجم نے دس اشرفیاں طلب کیں، بویہ نے اس پر اظہار عجز کیا، آخرکار منجم نے مجبور وناچار دیکھا تو کہا تمہارے تین بیٹے ہوں گے اور یہ سب ان آتش زدہ شہروں پر حکمرانی کریں گے، اور چار دانگ عالم میں ان کی شہرت ہوگی۔ بویہ نے کہا کیا یہ جائز ہے کہ تم مجھ سے استہزا کرو، میں مرد فقیر، میرے بچے تمہارے سامنے ہیں کس استعداد کی بنا پر بادشاہ ہوں گے، منجم نے کہا ان کی ولادت کی ساعت معلوم ہو تو بتاؤں، بویہ نے اپنے لڑکوں کی ولادت کی

---

[1] بستان المحدثین صفحہ ۲۸۔ [2] (The History of Philosophy in Islam) ص ۷۲

تاریخیں وساعتیں بتائیں منجم نے احتیاط کے ساتھ درجات طالع اور "نظرات کواکب" پر غور کیا، اور سب سے پہلے بڑے لڑکے عماد الدولہ علی بن بویہ کا ہاتھ چوما اور کہا کہ پہلے یہی لڑکا بادشاہ ہوگا اس کے بعد دونوں لڑکوں معز الدولہ اور رکن الدولہ کے ہاتھوں کو بوسہ دیا لڑکوں نے کہا اباجان اس منجم کو کچھ انعام دیجئے، بویہ خفا ہوا اور کہا یہ شخص تم سے مسخراپن کر رہا ہے۔ منجم نے کہا اگر میرے بیان پر تم کو اعتبار نہیں تو کم سے کم یہ عہد کرو کہ جب بلند مرتبہ پر پہونچو گے تو میرے ساتھ مہر وکرم سے پیش آؤ گے، ابو شجاع نے دس درم دئے۔ آج تاریخ کا طالب العلم جانتا ہے کہ منجم کی پیشین گوئی حرف بحرف صحیح ثابت ہوئی۔

الحاکم بامر اللہ فاطمی فاطمیہ مصر عباسیہ کے زبردست حریف گزرے ہیں تقریباً ڈھائی صدی تک اس خاندان نے حکمرانی کی اس گھرانہ کا مشہور حکمران الحاکم بامر اللہ بہت بڑا منجم گزرا ہے۔ چنانچہ معجم المذاہب والاخلاق (انسائیکلوپیڈیا آف ریجن اینڈ اتھکس) کے مقالہ نگار نے لکھا ہے کہ باوجودیکہ وہ فن نجوم میں مہارت رکھتا تھا لیکن اس نے عوام کو اس کی تحصیل سے قطعاً روک دیا تھا۔

الحاکم بامر اللہ کا قاعدہ تھا کہ وہ روزانہ صبح کے وقت ایک گدھے پر سوار ہوکر تنہا ایک پہاڑ پر سیر کے لئے جایا کرتا تھا، ایک دن اس نے زائچہ دیکھا تو کہا کہ اگر فلاں شب کو مجھے کوئی آسیب نہ پہونچے، تو میری عمر اسی برس سے متجاوز ہو جائے گی، جب شب معہودہ آپہونچی اور حاکم نے چاہا کہ پہاڑ کے طواف کے لئے روانہ ہو تو اس کی ماں نے بڑی منت وسماجت کے ساتھ اس کو روک لیا حاکم نے بھی کسی قدر توقف کیا لیکن تھوڑی دیر کے بعد سخت مضطرب ہوا، اور ماں سے کہا اگر مجھے جانے نہیں دوگی تو میری روح جسم سے پرواز کر جائے گی چنانچہ وہ پہاڑ پر گیا اور وہیں درباریوں کی ایک مخالف جماعت نے اس کا خاتمہ کر دیا۔

المعز الدین اللہ اسمٰعیلی یہ بھی فاطمیہ مصر کا ایک مشہور فرمانروا گزرا ہے اس کے متعلق محمد بن خوند شاہ لکھتے ہیں:-

> المعز الدین اللہ منجمے ماہر بود روزے ملاحظہ زائچہ خویش کردہ در آنجا قاطعے دید ایں صورت را با یکے از ارباب نجوم درمیان نہادہ دراں باب مشورت فرمود منجم گفت خلیفہ را چنیں روئے مستور بایدتا آں نکبت درگزرد، معز ازیں حدیث اعراض نمود[1]

اس کے بعد معز نے اعیان دولت کو جمع کیا اور فرمایا کہ میری زندگی کے دن ختم ہو رہے ہیں موت سر پر آچکی ہے میں اپنے لڑکے کو تمہارے سپرد کرتا ہوں، اور اس کو اپنا خلیفہ بناتا ہوں امید ہے کہ تم اس کی اطاعت کروگے،

[1] ابو شجاع بویہ دیلمی، حاکم بامر اللہ، اور معز الدین اللہ کے ان واقعات کے متعلق ملاحظہ ہو روضۃ الصفا جلد ۴۔

المعز نے اس لڑکے کا لقب العزیز باللہ رکھا اور ہمیشہ کے لئے آنکھیں بند کرلیں۔

ابوریحان البیرونی ابوریحان بیرونی عہد غزنویہ کا بہت بڑا علامہ گزرا ہے اس کی تصنیفات سے اسکی عالمانہ جامعیت کا اندازہ ہوتا ہے نجوم میں اس کو خاصہ درک تھا چنانچہ اس کے متعلق فرشتہ نے بہت پرلطف روایتیں لکھی ہیں۔

علم کے ساتھ علم کا پندار ہونا ناگزیر ہے ابوریحان بیرونی کے اسی استغنا سے سلطان محمود غزنوی کچھ خوش نہ تھا ایک دن سلطان اپنے مشہور باغ "ہزار درخت" کے سامنے محل کی چھت پر بیٹھا ہوا تھا کہ البیرونی آیا سلطان نے پوچھا کہ بتاؤ میں قلعہ کے ان چار دروازوں میں سے کس دروازہ سے باہر جاؤنگا منجم نے اصطرلاب مانگا اور طالع درست کرکے دیکھا، اور ایک پرزہ پر کچھ لکھکر سلطان کے سرہانے رکھدیا اس کے بعد سلطان نے حکم دیا کہ قلعہ کی شرقی دیوار کو توڑ دیا جائے، اور اسی طرف سے باہر گیا، اس کے بعد کاغذ مانگا دیکھا کہ لکھا ہوا تھا کہ ان چار دروازوں میں سے کسی دروازہ سے باہر نہیں جائیں گے، بلکہ پورب کی دیوار توڑ کر نیا راستہ بنایا جائیگا سلطان یہ معلوم کرکے بہت خفیف ہوا، اور حکم دیا کہ بیرونی کو محل کی دیوار سے نیچے پھینک دیا جائے، منجم نے پہلے ہی دیوار سے ایک پھندا لگا دیا تھا، اسی کے ذریعہ نیچے اتر آیا اور اس کو کوئی ضرر نہ پہونچا سلطان نے پوچھا یہ بھی تم نے دیکھا تھا، منجم نے کہا ہاں، اور اپنے غلام کے ہاتھ سے تقویم لیکر سلطان کو دکھا دیا کہ اس دن کے احکام میں لکھا ہوا تھا کہ اس کو ایک بلند مقام سے زمین پر پھینک دیں گے لیکن کوئی نقصان نہ پہونچے گا، اس سے سلطان کا غصہ بہت بڑھ گیا، اور علامہ بیرونی کو زندان میں بھیجدیا، اسی طرح چھ ماہ گزر گئے، ایکدن بیرونی کا غلام بازار سے گزر رہا تھا، کہ ایک "فال بین" نے اس کو بلایا اور کہا تمھارے طالع میں چند چیزیں میں نے دیکھیں، انعام دو تو بتاؤں، غلام نے دو درم دئے، فال بین نے کہا کہ تمھارا آقا ان دنوں مصیبت میں ہے لیکن آج سے تین دن کے اندر وہ اس مصیبت سے رہا ہو جائے گا، اور خلعت شاہی زیب جسم کریگا، غلام نے بشارت کے طور پر یہ خبر اپنے آقا کو پہونچائی، وہ ہنسا اور کہا تم میرے غلام ہوکر ایسے ایسے آدمیوں کی باتوں کا اعتبار کرتے ہو، لیکن فال بین کی یہ پیشین گوئی صحیح ثابت ہوئی، اور خواجہ احمد بن حسن میمندی کی سفارش سے بیرونی کو رہائی حاصل ہوگئی، بیرونی نے جب فال بین کو بازار میں بیٹھا ہوا دیکھا، تو اس کے سر سے منجمانہ پندار کا سودا بہت کچھ دور ہو گیا۔[1]

حسن گانگوی بہمنی ۷۴۸ھ ہندوستان کی تاریخ کا ایک بہت ہی اہم سال گزرا ہے اسی سال ایک برہمن کا مفلوک الحال خادم ہندوستان کے تخت پر بیٹھتا ہے اور دو سو برس کے

---

[1] ملاحظہ ہو تاریخ فرشتہ (ذکر فیروز شاہ بہمنی)

لگ بھگ اس کے خاندان میں حکومت رہتی ہے، ظفر خاں دکن میں آچکا ہے اور اس ساعت کے اختیار کرنے کے باب میں گفتگو ہو رہی ہے جبکہ علاءالدین حسن کے سر پر تاج شاہی رکھا جائے گا، دربار معلی علما و فضلا سے بھرا ہوا ہے ایک طرف برہمن جوتشی ہیں، دوسری طرف صدر الشریف سمرقندی اور میر محمد منجم بدخشی ہیں اختیار ساعت کے متعلق رائیں طلب کیجارہی ہیں ہندوستانی نجموں نے متفقہ طور پر ایک ساعت مقرر کردی اسلامی منجموں نے دوسری ساعت تجویز کی لیکن کثرت رائے برہمنوں کی طرف تھی، اسی ساعت سعید میں سلطان قطب الدین کی مسجد میں علاءالدین کے سر پر دکن کا تاج رکھدیا، ملا داؤد بیدری تحفۃ السلاطین میں اس واقعہ پر تبصرہ کرتے ہوئے، صدر الشریف سمرقندی اور میر محمد منجم بدخشی کے تاسف کا حال لکھتے ہیں ملا صاحب کا بیان ہے کہ جب علاءالدین کو اسلامی منجموں کے تاسف کا پتہ چلا تو ان کو خلوت میں طلب کیا اور کہا کہ آپ لوگوں کے افسوس کی کیا وجہ ہے؟ مجھے ازبس تشویش ہے، مسلمان منجموں نے جواب دیا کہ تشویش کی کوئی وجہ نہیں، لیکن ہم لوگوں نے تاجپوشی کے لئے جو ساعت اختیار کی تھی، اگر اسوقت یہ مبارک تقریب انجام پذیر ہوتی تو آپ کے خاندان کے ڈیڑھ سو سلاطین تخت دکن پر جلوہ افروز ہوتے، اور سات سو برس تک آپ کے گھرانہ میں حکومت رہتی، لیکن برہمنوں نے جو ساعت تجویز کی ہے، اس کے مطابق آپ کے خاندان میں بیس حکمران سے کم ہونگے، اور دو سو سال کے اندر حکومت ختم ہو جائے گی، فرشتہ اس واقعہ پر تبصرہ کرتے ہوئے رقم طراز ہے:۔

> مؤلف ایں حکایت بوالعجب می گوید کہ بعد از یک صد و ہفتاد و ہفت سال کہ دولت آل بہمنیہ منقضی ہو شد، بر علما و فضلائے صاحب انصاف صدق کلام آں دو بزرگوارہ مہارت الشیان در علم نجوم ظاہر گشت و نیز عدد شاہان بہمنیہ ہنوز بہ بست نفر نہ رسیدہ بود کہ آں سلسلہ صفت اختتام پذیرفت[1]

ابوطاہر منجم شیرازی

احکام نجوم کی تصدیق کے متعلق حمداللہ مستوفی القزوینی نے بھی تبریز کے سلسلہ میں بعض روایت درج کی ہیں وہ کہتے ہیں کہ زبیدہ خاتون[2] (اہلیہ ہارون الرشید) ۱۷۵ھ میں اس شہر کی بنیاد ڈالی، ۶۹ سال کے بعد ۲۴۴ھ میں جبوقت خلیفہ متوکل تخت بغداد پر متمکن تھا یہ شہر زلزلہ سے برباد ہوگیا، خلیفہ نے اس کی دوبارہ تعمیر کی، پھر ایکسو نوے برس کے بعد ۴۳۴ھ میں زلزلہ سے یہ شہر بالکل تباہ ہوگیا اس واقعہ کے وقت ابوطاہر منجم شیرازی تبریز میں موجود تھا، اس نے زلزلہ کی

---

[1] تاریخ فرشتہ مقالہ ۳، روضہ ۱

پیشین گوئی کی تھی، اور کہا تھا کہ یہ شہر بالکل برباد ہو جائے گا، حکام باشندوں کو مستعدی کے ساتھ شہر سے میدان میں لاتے تھے، تاکہ عمارات کی بربادی سے انسانی جانیں تلف نہ ہوں، پھر بھی شب موعودہ کو زلزلہ آیا اور تقریباً چالیس ہزار آدمی اس واقعہ فاجعہ سے ہلاک ہو گئے، خلیفہ قائم باللہ کی طرف سے جو شخص اس وقت اس شہر کا حاکم تھا اُسنے ابو طاہر منجم کے مشورہ سے شہر کی تعمیر شروع کی منجم نے برج عقرب کے طالع میں اس شہر کی تعمیر سے بار بنیاد رکھی اور یقین دلایا کہ پھر کبھی اس شہر کو زلزلہ سے خرابی نہ ہوگی لیکن سیلاب سے تباہی ہو سکتی ہے چنانچہ حمداللہ مستوفی اس کے متعلق لکھتا ہے:۔

وتاغایت کہ بر ترازد، سہ صد سال است حکم او راست آمدہ است وہر چند دراں شہر زلزلہ بسیار اتفاق افتادہ اما خرابی عظیم نہ کردہ[1]

اسلامی نجوم کے اصطلاحات

مسلمان لوگ علم نجوم کو پانچ حصوں میں تقسیم کرتے ہیں:۔

(۱) مثلاً منطقۃ البروج کے مختلف حصے، مقامات سماوی اور ہر سیارہ کے خصائص، بارہ بروج اور ان کے مالک سیارہ کے متعین کرنے کے طریقے، اور قرآن سیارگاں وغیرہ۔

(۲) الاحکام الی امور العالم (Prognostics of a Universal Character) وہ جنکا علاقہ حکومتوں کے قیام و زوال، خاندانوں کے عروج و ہبوط، مذاہب کے نشر و اضمحلال، جنگ کی خون آشامیوں، قحط کی تنگیوں، طوفان کے مصائب، بارش کے انعام، اور بازار کے فروغ و کساد سے ہے نجوم کے اس حصہ کو بطلیموس "تحویل جنع العالم" (Universal Apalelesmalics) کے نام سے موسوم کرتا ہے ان پیشین گوئیوں کا بڑا حصہ سیارہ کے ذریعہ حاصل کیا جاتا ہے جبکہ ہر (Tropics) سال کے موقعہ پر آفتاب برج حمل میں داخل ہوتا ہے۔

(۳) الموالید (Nativities) نجوم کے اس حصہ کو کہتے ہیں جس میں افراد کے حالات کے متعلق پیشین گوئی کی جاتی ہے یعنی ولادت کے وقت سیارہ کے عروج و ہبوط، شرف و زوال کی معلومات بہم پہونچا

(۴) مسائل (Interrogations) نجوم کا وہ حصہ جس کا تعلق سوالات کا جواب دینے سے ہے مثلاً ایک دور افتادہ عزیز کے حالات کی تفتیش چور کا پتہ لگانا بھاگے ہوئے غلام کے مقام روپوشی کی تعیین وغیرہ نجوم کے اس حصہ کا تعلق محض مسلمان منجموں سے ہے وہ لوگ جو بطلیموس کے حقیقی پیرو ہیں۔

---

[1] نزہت القلوب" مصنفہ حمداللہ مستوفی (بسلسلہ شہر تبریز)۔ [2] اسلامی نجوم کے اصطلاحات وارتقاء کے متعلق "معجم المذاہب والاخلاق" (Encyclopedia of Religion & Ethics) سے کتاب "شمس قمر و کواکب" سے استفادہ کیا گیا ہے۔

وہ "مسایل" کو تسلیم نہیں کرتے،

(۵) اختیارات (Eleeliones) یعنی کسی خاص کام کے آغاز کرنے کی نیک ساعت اس کا عام قاعدہ یہ ہے کہ منجمین پتہ لگاتے ہیں کہ اس ساعت میں قمر بروج دوازدہ میں سے کس برج کے اندر ہے، غالباً یونانیوں کے یہاں بھی یہی طریقہ مروج تھا، لیکن بعض اسلامی منجمین لحاظ رکھتے ہیں کہ اس وقت قمر اپنے اٹھائیس منازل میں سے کس منزل میں ہے یہ ہندوستان کی پیداوار ہے گو دراسیوس (Derothems کی طرف منسوب ہے بطلیموس کے متبعین "اختیارات" کو بھی تسلیم نہیں کرتے،

مختلف اثرات

اسلامی نجوم پر مختلف ممالک کا اثر پڑا ہے چنانچہ عربی زبان کے کتب نجوم سے پتہ چلتا ہے کہ مسلمان منجمین نے یونانی، ہندوستانی اور ایرانی اثرات قبول کئے ہیں۔

یونانی اثر

بطلیموس کی کتاب (Tetrobiblos Quadrapartitum) دراسیوس سدانیوس (Derolheus Sidonius) کی تحریریں (پہلی صدی مسیحی) اثینیہ کے مشہور منجم کی کتاب جو "مسایل" اور "موالید" وغیرہ پر ہے (دوسری یا تیسری صدی مسیحی) یہ ساری معلومات عربوں کے پیش نظر تھیں، ایک یونانی منجم ریلوس یا زیلوس کا نام بھی اسلامی منجموں کی تحریروں میں پایا جاتا ہے لیکن تحریف کے باعث مصنف کے اصلی نام کا پتہ نہیں چلتا، ایک دوسرے یونانی مصنف تنکلوس ( ) سے بھی مسلمان منجمین واقف تھے لیکن اس کے متعلق ایرانی ماخذ کے ذریعہ انھوں نے معلومات حاصل کئے۔

ہندوستانی اثر

مسلمان منجمین سات یا آٹھ ہندوستانی منجموں کا نام لیتے ہیں لیکن ابھی تک یہ پتہ نہ چلا کہ سنسکرت زبان میں ان کا اصلی نام کیا تھا، انمیں سب سے اہم شخصیت "کنکھ" (K. N. K. H.) یا "کنکہ" (K. T. K. H.) کی ہے جس کے متعلق بعض عربی کتابوں سے پتہ چلتا ہے کہ وہ ہندوستانی کتب (ہیئت) کے ساتھ خلیفہ منصور کے دربار (بغداد) میں آیا بعض عربی مصنفوں نے یہ بھی لکھا ہے کہ اس نے علم حساب کی تعلیم دی عرب لوگ "موالید" اور "قرآن سبعہ سیارگان" کے متعلق بعض تصنیفات اسکی طرف منسوب کرتے ہیں اس لئے یہ ظاہر ہے کہ اس نے ہندوستانی نجوم پر بحث کی ہوگی جس کو سنسکرت میں "ہورہ یا جاتک" کہا جاتا ہے اور جس پر یونانی اثر پڑا ہے، اس سے ایف بال (F. Ball) کے قیاس کی توثیق ہوجاتی ہے ابو معشر کے مقدمہ سے اس نے نتیجہ نکالا ہے کہ کنکھ کے پاس قدیم یونانی ماخذ کے مواد موجود تھے، کیونکہ اجرام سماوی کی جو صورتیں اس نے پیش کی ہیں ان سے یہی ظاہر ہوتا ہے اسلامی منجموں نے عموماً ہندوستانی ماخذ کا حوالہ دینے میں بجائے منجموں کا نام لینے کے صرف ہنود لکھا ہے۔

پھر بھی عربی اصطلاحات میں بعض ایسے ہندوستانی الفاظ کا پتہ چلتا ہے جو اسی شکل میں موجود ہیں مثلاً "دریجان" جو ہندوستانی "درکانہ" Dare khana کی تحریف ہے۔

ایرانی اثر عہد وسطیٰ کی پہلوی زبان سے مسلمان منجموں نے استفادہ کیا ہے پہلی صدی کے نصف آغاز میں تنک لوش بابلی Teucrus کی کتابیں جو اجرام سماوی اور (Decans) کے متعلق تھیں۔ فارسی ترجمہ کے ذریعہ مسلمانوں تک پہونچیں یہاں یہ مصنف پہلوی تصنیفات کے باعث تنک لوس (یا تنکم، لوش یا تنک لوشا) کے نام سے مشہور ہوا[1]، اسی لئے ابو معشر نے اپنے مقدمہ میں اسکی تعلیمات کو "مذہب الفرس" کے نام سے موسوم کیا ہے اور اس میں منازل قمر کے بعض فارسی نام بھی پائے جاتے ہیں، دوسرا ذریعہ بزرجمہر کی شرح تھی، جس کا یونانی سے پہلوی میں "وزیزک" (منتخب) کے نام سے ترجمہ ہوا تھا لیکن عربی میں "البزیرج" بن گیا اور اس کے بعد عرب مصنفوں نے توڑ مروڑ کر عجیب وغریب تحریفیں پیدا کر دیں نجوم کے سلسلہ میں مسلمان منجموں نے خرافیاتی زردشت کا بھی حوالہ دیا ہے جس کا نام چوتھی صدی اور اس کے بعد یونانی علم نجوم میں یقیناً متداول تھا، چوتھا ذریعہ زادان فرخ کے بیٹے "الاندرزگر" کی کتاب متعلقہ "موالید" تھی، اس شخص کے متعلق صحیح حالات معلوم نہیں چونکہ القبیصی (مسلمان منجم) کے "موالید" اور ابن عزرا (یہودی منجم) کے لاطینی تراجم میں اس کے نام کی مختلف تحریفیں پائی جاتی ہیں، نجوم کی وہ کتابیں جو جاماسپ (مشہور صوفی بادشاہ گشتاسپ کا مشورہ کار) کی طرف منسوب ہیں آخری زمانہ کے مسلمانوں کے حسن عقیدت کا نتیجہ ہیں ورنہ یہ کتابیں جاماسپ کی لکھی ہوئی نہیں ہیں۔

ہم لوگوں کو اس کا صحیح علم نہیں کہ ان ساری کتابوں کا عربی زبان میں ترجمہ ہوا، لیکن یہ یقینی ہے کہ آٹھویں صدی کے نصف ثانی میں یہ کتابیں مشہور تھیں، یہ وہ وقت تھا جبکہ مسلمانوں کے تمدن کا آغاز ہو چکا تھا، اگر "ہرمس" کی کتاب "المفتاح النجوم" کے قلمی نسخہ (جو Milan کے کتب خانہ میں محفوظ ہے) کا بیان صحیح مانا جائے تو ماہ ذوالقعدہ ۱۲۵ھ میں اس کتاب کا ترجمہ ہوا یعنی اسوقت خلفائے بنی امیہ سریر آرائے حکومت تھے خلیفہ منصور (۱۳۶ھ - ۱۵۸ھ) کے زمانہ میں پہلے پہل یحیی البطریق نے بطلیموس کی کتاب Tetrabiblos

---

[1] خاقانی نے بھی اپنے قصیدہ میں اس مصنف کا تذکرہ کیا ہے وہ بھی اس کو "تنک لوشا" کہتا ہے اس سے جہاں معجم المذاہب لاخلاق کے مقالہ نگار کی اس رائے کی توثیق ہوتی ہے کہ مسلمان منجمین اس مصنف سے پہلوی ماخذ کے ذریعہ واقف ہوئے وہاں یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ خاقانی کو اس علم میں کس قدر ید طولیٰ حاصل تھا، اور اس علم کی کیسی اہم کتابیں اور ان کے مصنفین اس کے پیش نظر تھے وہ کہتا ہے:-

بہ نام قیصراں سازم تصانیف — بہ از ارتنگ چین و تنک لوشا

کا ترجمہ کیا آٹھویں صدی کے نصف ثانی میں ماشاء اللہ نے اپنی تصنیفات میں دراسیوس اور انطاکیوس کے حوالے کنکھ کی کتابیں خلیفہ منصور ہی کے زمانہ میں سنسکرت سے عربی میں منتقل ہوئیں نویں صدی کے وسط میں کندی نے نجوم پر مختصر رسائل لکھے، جن کو ہندوستانی نمونہ پر ترتیب دیا گیا تھا یہ تقریباً یقینی ہے کہ خاندان نوبخت کے افراد نے پہلوی زبان سے عربی میں فارسی کتابوں کا ترجمہ کیا اس خاندان کا سردار خلیفہ منصور کے دربار میں "منجم" تھا، بعض ایسے حقایق بھی ہیں جن سے صاف پتہ چلتا ہے کہ عربی نجوم پر ایرانیوں کا اثر پڑا ہے کیونکہ ماشاء اللہ کے رسایل میں جن کا یوحنا اشبیلی نے لاطینی میں ترجمہ کیا ہے ایرانی ماخذ کے بعض اصطلاحات پائے جاتے ہیں جیسے الکتخدا، الجانجتان وغیرہ۔

تحریری دستاویزات کے علاوہ زبانی روایتیں بھی تھیں جو نو مسلم قومیں اپنے ساتھ اسلام میں لائیں، حران میں قدیم عہد جاہلیت کے علوم کے ساتھ نجومی روایتیں بھی ترقی پر تھیں سیوفیلوس (Theophilus) بن طامس جو اڈیسہ کا رہنے والا اور مسیحی مذہب کا پیرو تھا خلیفہ مہدی کا درباری منجم تھا چند مسلمان منجموں نے "اختیارات" کے موضوع پر اس سے استناد کیا ہے اس نے شام کی زبانی روایتیں لیں اسی طرح یہ بھی قدرتی ہے کہ مسلمانوں کے تمدن میں آرامی مراکز دیار بکر، اور بابل اور مصریوں کے منجمانہ عقاید جذب ہوئے، مسلمانوں کے علم نجوم کے ابتدائی زمانہ میں یہودی عنصر کا بھی اثر پڑا ہے، اس کا ثبوت یہ ہے کہ دوسری اور تیسری صدی کے مخصوص منجموں میں ماشاء اللہ، سہل ابن بشر، ربان الطبری، اور سند ابن علی ہیں اور یہ سب یہودی تھے۔

یورپ پر اثر

بارھویں صدی سے پندرھویں صدی کے اخیر تک لاطینی عہد وسطی کا علم نجوم حقیقۃً عربی نجوم ہے اس عہد میں سارے ذخیرہ نجوم کا ماخذ عربی تھا، چنانچہ ابومعشر، القبیسی، الکندی، المنصور، الفضل، عمر، ماشاء اللہ، ذہیل وغیرہ نے اپنے افکار و آراء اور اپنی تصنیفات و مولفات سے یوروپی علماء کو اثر پذیر کیا بطلیموس کی دو کتابوں کے عربی تراجم سے بھی یوروپی علماء نے استفادہ کیا لاطینی زبان میں منجمانہ اصطلاحات کے لئے یا تو عربی کے لفظی ترجمے ہیں............ یا عربی کلمات کی تحریف، بزنطینی دنیا میں عربی اور فارسی زبانوں کے ذریعہ اسلامی نجوم کے بہت سے آثار پائے جاتے ہیں اس لئے قدیم یونانی تصنیفات کے پہلو بہ پہلو ابومعشر، احمد ابن یوسف الضیاء، ماشاء اللہ، سہل ابن بشر اور دوسرے عربی مصنفوں کی کتابیں نظر آتی ہیں اس طور سے نجوم کے متعلق بزنطینی کتابوں میں سیاروں کے اسماء اور فنی اصطلاحات کے لئے عربی فارسی نام ہیں جن کو قدیم یونانی ناموں سے کوئی مناسبت نہیں آخر میں یہ بھی بتا دینا ضروری ہے کہ یورپ کا یہودی ادب نجومی جس میں ابراہیم ابن عزرا کی نمایاں شخصیت نظر آتی ہے،

عربی ماخذ سے مستفاد ہے۔

اسلامی نجوم کی خصوصیت

ساتویں، آٹھویں اور نویں صدی میں دنیا کے مختلف اقوام یونانی و قبطی، شامی، ایرانی اور اہل ہند پر عربوں کا تسلط ہوا تو ان قوموں نے حوادث اور اثرات کواکب کے متعلق پہلے ہی تمام ممکن اصولی باتیں خیال کر رکھی تھیں، اس لئے مسلمانوں کے لئے کوئی نئی چیز پیش کرنے کا موقعہ نہ تھا باوجود اس کے اسلامی نجوم ساری دنیا حتی کہ یونانیوں کے فن نجوم سے بھی بالاتر اور ایک حقیقی ترقی کا علمبردار ہے۔

نجوم اور اسلامی فلاسفہ وائمہ

ابومعشر اپنے مقدمہ (۸۴۹ء) میں سات قسم کے آدمیوں کو نجوم کا مخالف بتاتا ہے اور دفاع میں بطلیموس کے انھیں مباحث کو بسط و کشاد کے ساتھ پیش کرتا ہے جو اس نے نجوم کے فواید کے سلسلہ میں لکھے ہیں اور مستقبل کے متعلق پیش بینی سے جو مادی اور اخلاقی منافع ہیں ان پر روشنی ڈالی ہے اسی طرح الکندی (فیلسوف العرب) نے نجوم کو حکمت کی ایک شاخ بتایا ہے وہ اسکو نہ صرف ریاضی کے قوانین اربعہ بلکہ طبیعاتی اور ماوراطبیعی قوانین پر مبنی بتاتا ہے غالباً الکندی ہی وہ شخص ہے جس نے نجوم کو عقلی اور باضابطہ اصول و طرق کے ماتحت مرتب کیا لیکن معاملہ نے فوراً ہی دوسرا رخ اختیار کیا دوسری صدی ہجری کے آخر میں ارسطو کی تعلیم پوری طرح ترقی پر تھی، اور یہاں نجوم کا گزر نہ تھا، اس لئے فلاسفہ نے اس فن کے خلاف نزاع شروع کر دی اسی طرح علمائے دین نے بھی مخالفت شروع کی اس سلسلہ میں بہت سی کتابیں و رسایل رد میں لکھے گئے چنانچہ ان میں سب سے قدیم ابوالقاسم عیسی بن علی کی کتاب ہے جو نجوم کے رد میں ہے اور جو حنبلی امام ابن قیم الجوزی کی کتاب، مفتاح دار السعادہ میں محفوظ ہے عیسی بن علی کا معاصر فارابی بھی اس کا مخالف تھا اور کیوں نہ ہوتا جبکہ وہ ارسطو کے فلسفہ کا ماہر اور بیرو تھا نجوم کے رد میں اس کی ایک کتاب ہے لیکن یہ کتاب ایسی نہیں جو اتنے بڑے فلسفی کے شایان شان ہو اس میں بہت سی بچوں کی سی بحثیں ہیں فارابی کی یہ کتاب محض حواشی کا ایک سلسلہ ہے، جسے اس کے ایک شاگرد نے بجنسہ شائع کر دیا۔

فارابی کے تمام معاصر فلسفیوں نے اس مخالفت نجوم میں حصہ نہیں لیا بلکہ حقیقت یہ ہے کہ جن مذاہب فلسفہ پر ارسطو کا زیادہ اثر نہ تھا انھوں نے اس کی حمایت کی جیسا کہ الکندی کے واقعہ سے ثابت ہوا اسی طرح بصرہ میں اخوان الصفا اور بغداد میں ابوسلیمان محمد بن طاہر ابن بہرام السجستانی المنطقی نے بھی نجوم کے متعلق کتابیں لکھیں اخوان الصفا کے یہاں "قرآن سیارگان" خاص موضوع بحث تھا؛ سجستانی کے زمرۂ فلاسفہ کی اکثر بحثیں ابوحیان التوحیدی (چوتھی صدی ہجری) نے اپنی کتاب المقالسات میں جمع کی ہیں اسی طرح

اس جماعت نے نجوم پر بھی رد و قدح کی ہے اور یہ پوری بحث ابن قیم کی کتاب میں ماخوذ ہے۔

بوعلی سینا نے نہ صرف الشفا اور النجات میں نجوم کی مخالفت کی ہے بلکہ اپنی اس خاص کتاب میں بھی اس کے خلاف لکھا ہے جس پر اے ایف مہرن نے ۱۹۲۴ء میں پوری طرح روشنی ڈالی ہے وہ کہتا ہے کہ یہ ایک بے بنیاد فن ہے اور اس کی نظری حقیقت کو تسلیم کرنے کے باوجود وہ لکھتا ہے کہ اس کا علم حاصل کرنا انسان کے لئے ناممکن ہے۔

ابن رشد (م ۵۹۵ھ) کے متعلق بھی یہ طے شدہ ہے کہ وہ نجوم کا مخالف تھا، جیسا کہ خود اس نے ارسطو کی بعض کتابوں کی شرح کے سلسلہ میں لکھا ہے لیکن یہ ایک غیر مفید بات ہے کہ ہم ان فلاسفہ پر ایک تبصرہ کریں جو مخالفت نجوم کے اس مسئلہ میں متفق ہیں بلکہ زیادہ دلچسپ یہ ہوگا کہ ہم مذہبی اماموں کے اس رویہ پر روشنی ڈالیں جو نجوم کے خلاف آخری نویں صدی ہجری میں انھوں نے اختیار کیا تھا۔

امام ابن حزم اشاعرہ اندلس اور ان کے مذہب کے مخالف تھے، انھوں نے نجوم کے متعلق اپنی کتاب الفصال فی الملل والاہوا والنحل میں خیالات کا اظہار کیا ہے وہ ان لوگوں کو جو یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ مستقبل کے متعلق کواکب کی وساطت سے پیشین گوئی کی جاسکتی ہے دو حصوں میں تقسیم کرتے ہیں (۱) کفار و مشرکین۔ (۲) گمراہ لوگ۔ پہلے تو وہ ہیں جو یہ کہتے ہیں کہ کواکب اور اجرام سماوی ذی عقل ہستیاں ہیں، ان کے اعمال ہیں اور ان کا استقرار دائمی ہے موجودات ارضی پر اللہ کے ساتھ یا خود اپنا اثر ڈالتے ہیں دوسری جماعت والے وہ لوگ ہیں جو کہتے ہیں کہ خدا نے کواکب اور اجرام سماوی کو آنے والے واقعات و حوادث کا آئینہ دار بنایا ہے۔

امام غزالی (م ۵۰۵ھ) جو مذہب اشعری کے محافظ تھے، اپنی کتاب احیاء العلوم الدینیہ میں نجوم کی مخالفت کرتے ہیں اور یہی رویہ حنبلی امام ابن تیمیہ (م ۷۲۸ھ) نے بھی اپنی کتابوں میں نجوم کے خلاف اختیار کیا ہے لیکن نجوم کے متعلق سب سے زیادہ سخت اور مکمل تردید حنابلہ کے مشہور امام ابن قیم الجوزی (م ۷۵۱ھ) کی کتاب مفتاح دار السعادۃ میں پائی جاتی ہے۔

مذہبی دنیا میں غالباً نجوم کی کفالت کرنے والے مجدد امام فخر الدین رازی (م ۶۰۶ھ) ہیں یہ قرآن مجید کی عظیم الشان تفسیر کے لئے خصوصیت کے ساتھ بہت مشہور ہیں انھوں نے دینیات، فلسفہ اور نجوم پر بہت سی کتابیں لکھیں اور طب و ریاضی کی بھی تحصیل کی، نجوم پر آپ کو پورا اعتقاد تھا اور یہ نتیجہ تھا علوم حکمیہ کی تحصیل کا، تفسیر قرآن سے آپ کا یہ اعتقاد صاف ظاہر ہے، امام فخر الدین رازی نے جس جرأت کے ساتھ قرآن کی تفسیر اور احادیث کی تاویل کی اس کی نظیر کسی دوسرے دینی عالم کے یہاں نہیں ملتی، نجوم کے متعلق ابن قیم الجوزی اور آپ کے پیشروؤں کی بحث و نظر اور رد و قدح کے بعد اس موضوع کی تمام بحث و نزاع

میں کوئی ندرت باقی نہ رہی ہاں تاریخ کے فلسفی کبیر ابن خلدون (۱۴۰۶ء) نے اپنے تاریخی مقدمہ میں جن خیالات کو ترقی دی وہ قابل غور ہیں

نجوم کو جس طرح علمائے طب و ریاضی نے اہمیت دی اسی طرح مذہبی علماء اور شعراء نے بھی اس فن پر توجہ مبذول کی چنانچہ موسیقی و شاعری کو بھی نجوم سے وابستگی رہی بالخصوص بعض شعراء تو نجوم کے ماہر گزرے ہیں تیسری صدی ہجری میں یحیٰ ابن علی ابن یحیٰ المنجم موسیقی کے بہت بڑے عالم اور مصنف گزرے ہیں آپ کا ایک رسالہ جو موسیقی پر ہے متحف برطانی (British Museum) لندن میں محفوظ ہے آپ کو موسیقی کے ساتھ نجوم سے بھی خاص شغف تھا چنانچہ اسی لئے آپ "المنجم" کے لقب سے مشہور ہیں[1]۔ عمر خیام کو مصنف "ہسٹری آف دی سائنسز" نجومی شاعر یا "فلکی شاعر" کے نام سے یاد کرتے ہیں حکیم مومن خاں کا مشہور شعر ہے:-

اس نصیبے پہ کیا اختر شناس　　آسماں بھی ہے ستم ایجاد کیا

مومن خاں ایک بلند پایہ طبیب بھی تھے، اس لئے ممکن ہے ڈاکٹر ڈلی بویر کے سطور بالا کے مطابق انھوں نے اپنے پیشہ کے لحاظ سے اس اہم فن کی تکمیل بھی کی ہوئی، لیکن غالب تو صرف شاعر ہی تھے، وہ بھی فرماتے ہیں۔

ہم ز آغاز بہ خوف و خطر ستم غالب　　طالع از قوس و شمار از سر طانم دادند

شعر پڑھنے کے بعد صاف معلوم ہو جاتا ہے کہ شاعر "خصایص بروج" سے واقف تھا[2]۔

(باقی)

عبد المالک آروی

فلسفۂ مذہب صرف آٹھ آنہ میں

اُردو میں پہلی کتاب ہے جو اسلامی شعائر و عقاید پر ناقدانہ نقطۂ نظر سے لکھی گئی ہے اور ضرورت ہے کہ ہر مسلمان اس کا مطالعہ کرے۔ چونکہ اس کی جلدیں کم رہ گئی ہیں اس لئے اسٹاک ختم کرنے کیلئے بجائے ایک روپیہ کے آٹھ آنہ میں ملسکتی ہے محصول اسکے علاوہ ہوگا (منیجر نگار)

---

[1] "دائرۃ المعارف الموسیقیہ"، مؤلفہ الاستاذ جول روانیت مطبوعہ مصر ص ۲۰۔ [2] مسلمانوں کے منجمانہ شغف کا اندازہ ان تصنیفات سے کیا جا سکتا ہے جن کی فہرست حاجی خلیفہ نے "کشف الظنون" میں دی ہے اس کتاب کا ایک نسخہ مع جرمن ترجمہ میرے پیش نظر ہے، نجوم کی عربی کتابوں اور ان کے مصنفین کی تفصیل مضمون ہذا کے آخر میں درج ہے۔

باب المراسلۃ والمناظرہ

بدایوں کی ایک خاتون (؟) کی گمنام تحریر

نیاز صاحب!

آداب بصد آداب قبول فرمائیے۔ شاید آپ باور نہ فرمائیں۔ لیکن یہ ایک حقیقت ہے جسے آپ باور فرمانے پر مجبور ہیں۔ خدا معلوم میں کیا کہنا چاہتی ہوں۔

میرے "محترم" کو جناب کا ذکر "بہ بدی بھی منظور" نہیں ہے۔ اور میں آہ!

اگر جناب کا ذکر خواہ وہ تعریف ہی کیوں نہ ہو کوئی کرتا ہے تو مجھے "بات بگڑ" جانے کے امکانات پیدا ہوتے ہوئے معلوم ہوتے ہیں۔

آپ کے مضامین کا ہر لفظ ایک خاص جاذبیت ایک خاص دلکشی رکھتا ہے۔ یا یوں کہئے کہ ہر لفظ بجائے خود ایک مکمل 'شعر' ہوتا ہے۔ اگر شعر کی یہ تعریف صحیح ہے۔

(The best words in their best order) (Milton)

ایک عرصہ سے آرزو تھی کہ آپ سے کچھ عرض کروں۔ لیکن 'حسن عقیدت' مانع تھا۔ اور اب چونکہ "آرزو" اور "حسن عقیدت" میں صلح ہو چکی ہے۔ لہذا "آرزو" کو اجازت ہے کہ وہ آپ کو تھوڑا بہت لکھ سکتی ہے۔ لیکن آئین عقیدت سے متجاوز نہ ہو۔ خیر۔

کچھ "اسباب پریشانی" ارسال ہیں۔ جناب کو زحمت دینے کے لئے، اگر ایک شعر بھی جناب کو پسند آگیا، تو زندگی بھر مسرور رہوں گی بلکہ مغرور!

جناب کے فرمانے سے قبل میں اس کا اعتراف کرتی ہوں کہ میرا شعر کہنا۔ کوہ کندن اور کاہ برآوردن سے کسی طرح کم نہیں ہے۔ لیکن آخر کیا بھی کیا جائے۔ پھر یہ کہ سناؤں کس کو۔ چاند تاروں کو سنانا میرے بس کی بات نہیں۔ انسان یہاں بستے نہیں، یا میں خود انسان نہیں ہوں۔

کاش آپ ایک شعر پر اتنا ہی کہدیتے "غنیمت ہے"، تو میری عید ہو جاتی۔

وصالِ یار کی مسعود ساعتیں مت پوچھ   دلِ خراب کو کیا کیا تھیں جرائتیں مت پوچھ
مری ندامتِ بیہم اور اعترافِ گناہ   حسینِ دوست کی رنگیں شکایتیں مت پوچھ
کسی کا وعدۂ باطل مراالیقینِ تمام   وہ انتظار کی بے چین راحتیں مت پوچھ
عدو کی بزم میں بیباکیاں تری اور ہم   گزر گئی ہیں جو دل پر قیامتیں مت پوچھ
ہنوز تیرے تصور میں خوں بہاتی ہیں   شکیب وصبر کی ناکام حسرتیں مت پوچھ

ہنوز یاد ہے وہ شکل زندگی تصویر
بگڑ بگڑ کے بنی تھیں جو صورتیں مت پوچھ

ستمبر کے "نگار" کی بے چینی سے منتظر ہوں تاکہ یہ طے کر سکوں کہ کونسا شعر سونے کے حرفوں سے لکھے جانے کے قابل ہے۔

افسوس ہے کہ نہ میں ہی نگار کی خریدار ہوں نہ کوئی میرے یہاں۔ ہاں خدا اُس عزیز بہن کو خوش رکھے جو ہر مہینے دو چار دن کے لئے نگار کی زیارت کرا دیتی ہے۔

نیاز کیش تصویر

(نگار) میرے لئے اس سے زیادہ تکلیف دہ امر کوئی نہیں کہ کسی خاتون کی طرف سے گمنام تحریر میرے پاس بھیجی جائے اور اس کا جواب بھی طلب کیا جائے، لیکن اس قسم کی تکلیف مجھے اکثر پہونچتی رہتی ہے اور خدا جانے کیوں میں بعض تحریروں کی طرف اعتنا کرنے پر بھی مجبور ہو جاتا ہوں۔

اس تکلیف کا سب سے پہلا سبب یہ ہوتا ہے کہ اول تو نصف سے زیادہ تحریریں ایسی ہوتی ہیں جن کے متعلق مجھے یہ سوچنے کی ضرورت ہوتی ہے کہ کیا حقیقتاً وہ نسائی دست وقلم کا نتیجہ ہیں۔ اور اگر "حسنِ ظن" سے کام لیکر یہ باور کرلوں تو پھر دوسرا سبب الجھن کا یہ ہوتا ہے کہ جواب دوں بھی تو کس کو اور کس پتہ سے۔ نگار کے صفحات کو واسطہ بنانا اول تو مجھے پسند نہیں اور پسند ہو بھی تو بعض باتیں ایسی ہوتی ہیں جن کا ذکر برملا مناسب معلوم نہیں ہوتا۔ علاوہ اس کے کچھ غصہ مجھے اس بات پر بھی آتا ہے کہ جب کسی عورت کا ماحول اس قسم کی مراسلت کے منافی ہو تو اسکو اس جسارت کی ضرورت ہی کیا ہے اور وہ کیوں اس اخلاقی کمزوری میں مبتلا ہوتی ہے۔

اب مثلاً اسی تحریر کو لیجئے جو اوپر درج کی گئی ہے۔ کہ اس کا کوئی فقرہ کوئی ایک لفظ بھی ایسا نہیں جسے اُسے کسی خاتون کا نتیجہ فکر ثابت کر سکے۔ اس لئے نہیں کہ اس سے کسی ایسی غیر معمولی قابلیت کا اظہار ہوتا ہے

جو عام طور پر عورتوں میں نہیں پائی جاتی - بلکہ صرف اس لئے کہ مرد ہو جانے کے بعد بھی ایک عورت اپنی ذہنیت کو نہیں بدل سکتی اور ناممکن ہے کہ اس کی تحریر اس کی غمازی نہ کرے لیکن اس تحریر میں شروع سے اخیر تک اک ایسی مردانہ کرختگی پائی جاتی ہے جو عورت کی طرف سے کبھی ظاہر نہیں ہو سکتی -

رامپور کی ایک خاتون ہیں جن سے میرا سلسلۂ مراسلت عرصہ سے قایم ہے اور وہ ہمیشہ قصداً مردانہ انشار اور مردانہ لب ولہجہ ہی میں مجھ سے خطاب کیا کرتی ہیں، لیکن باوجود اس تمام سعی وارادہ کے ایک تحریر میں اُن کے قلم سے یہ فقرہ نکل ہی گیا کہ —— "ہائے، اللہ کیا کروں، آپ کی مختصر نویسی نے تو میری جان عذاب میں مبتلا کر رکھی ہے" —— اور میں دیر تک ان کے مردانہ پندار کی شکست پر لطف اُٹھاتا رہا — الغرض

اے خاتونِ محترم،

اول تو مجھے اس بات کے باور کرنے میں تامل ہے کہ آپ واقعی عورت ہیں، کیونکہ آپ کا اندازِ تحریر آپ کا طرزِ انشار اور سوادِ خط سب مردوں کا سا ہے اور میں نہیں سمجھ سکتا کہ آپ نے یہ نقاب اپنے چہرہ پر ڈالنا کیوں پسند کیا، جبکہ خط وخال کی ناموزونی چھپانے میں آپ کو مطلق کسی قسم کی کامیابی حاصل نہیں ہو سکی- لیکن اگر — زہے نصیب کسی کے —— آپ واقعی وہی ہیں جو اپنے آپ کو ظاہر فرماتی ہیں، تو میں عرض کروں گا کہ عورت ہونا اگر بلا ہے تو دوسروں کے لئے خود عورت کے لئے نہیں کہ وہ اپنی خصوصیات کو مٹانے کی کوشش کرے — اگر آپ کو فطرت کی طرف سے ادبی ذوق مرحمت ہوا ہے —— اور یقیناً مرحمت ہوا ہے — تو اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ آپ مردوں کی صف میں شامل ہو کر اس کی نمایش کریں، آپ عورت ہیں تو عورت ہی کی باتیں کیجئے، عورت ہی کی طرح چھیڑ چھاڑ کیجئے —— رستم واسفندیار کے تیوروں کے ساتھ نہیں کہ مرد بھی "ہاری" بول اُٹھیں -

آپ کے "محترم" کو اگر میرا "ذکر بہ بدی" بھی منظور نہیں تو اس "خاکسار" کو بھی یہ شکایت ہے کہ میرا ذکر آخر آپ اُس بزم میں کریں ہی کیوں، جہاں "غیر کی بات بگاڑنا" اور میری قسمت سدھارنا دونوں میں سے کوئی ایک بھی آپ کے بس کی بات نہیں -

آپ نے جن الفاظ میں میری تحریروں کی دلکشی کا ذکر کیا ہے، وہ میری تحریر سے کہیں زیادہ دلکش ہیں، اس لئے میں انھیں کو آپ کے حضور میں پیش کر کے قبول کئے جانے کی تمنا رکھتا ہوں -

آپ کے "حسنِ عقیدت" اور "آرزو" میں صلح ہو گئی، اچھا نہ ہوا، کیونکہ "آرزو" کا وجود اسی وقت تک ہے جب تک وہ "حسنِ عقیدت" سے بے نیاز ہے - اور جب آپ نے اس طرح اپنی "آرزو" ہی کو برباد کر دیا تو پھر میں کیا خاک آپ سے یہ مطالبہ کر سکتا ہوں کہ :- کاش پوچھو کہ مدعا کیا ہے -

یہ بات آپ نے بہت عجیب لکھی کہ جہاں آپ ہیں وہاں انسان نہیں بستے یا یہ کہ آپ خود انسان نہیں ہیں ـ یہ بات کہیں اور کی ہوتی تو میں حکم لگا دیتا کہ یقیناً وہاں انسان نہیں بستے، لیکن چونکہ معاملہ "بدایوں" کا ہے جہاں کے ایک "انسان" سے میں واقف ہوں اس لئے یوں کھلم کھلا آپ کی ہمنوائی کرتے ذرا ڈر معلوم ہوتا ہے ـ اُن سے پوچھتا ہوں، دیکھئے کیا کہتے ہیں؟

آپ کی غزل میں نے نہایت غور سے پڑھی اور میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ "کوہ کندن وکاہ برآوردن" نہیں بلکہ "کاہ کندن وکوہ برآوردن" ہے ـ تمام اشعار اچھے ہیں اور مطلع و مقطع تو خصوصیت کے ساتھ نہایت خوب ہیں اور یہ باور کر لینے کے بعد کہ یہ جذبات ایک عورت کے ہیں، میں آپ ہی کے الفاظ میں یہ کہنے پر مجبور ہوں کہ

گزر گئی ہیں جو دل پر قیامتیں مت پوچھ

نگار کے گزشتہ سالوں کے پرچے حسب ذیل قیمت پر علاوہ محصول مل سکتے ہیں

۲۲ء ستمبر ۳ر ـ ۲۴ء جنوری ۸ر ـ فروری ۴ر ـ مارچ ۸ر ـ اپریل ۸ر ـ مئی ۸ر ـ اگست ۸ر ـ ۲۶ء جنوری ۴ر ـ مئی ۳ر ـ جون ۳ر ـ اکتوبر ۳ر ـ نومبر ۳ر ـ ۲۷ء مارچ ۳ر ـ اپریل ۶ر ـ مئی ۳ر ـ جون ۳ر ـ ۳۰ء مارچ ۸ر ـ مئی ۶ر ـ ستمبر ۸ر ـ اکتوبر ۸ر ـ نومبر ۸ر ـ ۳۱ء جولائی ۴ر ـ اگست ۴ر ـ ستمبر ۴ر ـ اکتوبر ۴ر ـ نومبر ۴ر ـ دسمبر ۴ر ـ ۳۳ء فروری ۴ر ـ جولائی ۶ر ـ ستمبر ۸ر ـ اکتوبر ۶ر ـ دسمبر ۸ر ـ ۳۴ء فروری ۸ر ـ مارچ ۸ر ـ اپریل ۸ر ـ جون ۸ر ـ اکتوبر ۸ر ـ

دو روپیہ یا اس سے زیادہ قیمت کے پرچے وی پی کے ذریعہ سے بھی بھیجے جاسکتے ہیں، اس سے کم کے لئے پیشگی رقم ذریعہ ٹکٹ یا منی آرڈر وصول ہونا ضروری ہے ـ

۳۲ء کا پورا فائل بارہ پرچوں کا تین روپیہ میں ـ علاوہ محصول

منیجر نگار لکھنؤ

سبدِ گل

کچھ خبر اس کی نہیں کس گل کی یہ آواز ہے
بلبلِ رنگیں نوا محوِ صدائے ساز ہے

پھر وہ پھر گرم تکلم پردہ برانداز ہے
نغمۂ موج صبا کیا؟ دور کی آواز ہے

فرصتِ تکمیلِ معصیت بھی تو ممکن نہیں!
ہر نفس بیدار پھر چشمِ تحیر باز ہے!!

دوڑتا پھرتا ہے قلبِ خار میں گل کا لہو
بلبلِ آسودہ لیکن زمزمہ پرداز ہے

کچھ خبر بھی ہے تجھے بیگانۂ ذوقِ حیات
داغِ ناکامی بہارِ مدعا کا راز ہے؟

بہارِ لالہ، نمودِ شبنم، نمائش معتبر نہیں ہے
نگہ کی صورت فریب کھانا طریقِ اہلِ نظر نہیں ہے

جو حسن خود راہ زن نہیں ہے تو عشق بھی راہبر نہیں ہے
یہ کیسی افتادگی غم ہے کہ اب کوئی ہم سفر نہیں ہے؟!

نسیم نے اس مزے سے چھیڑا کہ نکہتیں ہو گئیں پریشاں
کلی کلی میں وہ چھپ گئے تھے کہ پردہ ہر پردہ در نہیں ہے

فسانۂ دل سنا رہا ہوں وہ روٹھتے ہیں منا رہا ہوں
انہیں بہاروں میں کھو گیا ہوں کچھ اور مجھکو خبر نہیں ہے

تمام صہبا، تمام مستی، وہ سر سے پا تک تمام شوخی
نظر اُٹھاؤں تو کیا اُٹھاؤں کہ مجھ میں تابِ نظر نہیں ہے

بہار کیا؟ بس تری نوازش، نگاہ کیا؟ صرف ایک سازش
انہیں کی ساری عنایتیں ہیں کچھ اور مجھکو خبر نہیں ہے

گئی نہ محرومیوں کی اُلجھن مٹا نہ ارمان زندگی میں
مآلِ رازِ طلب بھی شاید حریفِ اُلفت ہی عاشقی میں؟

نصیب اُنکا ہی قرب لیکن، ہنوز اُلجھن ہی دوریوں کی
"نشاطِ بے حد" کے تذکرے کیا؟ دلِ ستم کش کی بیکلی میں

نقاب رنگیں، شباب میگوں، ہزار جلوے ہزار افسوں
عجب تھی حسنِ صنم کی صورت جو میں نے دیکھی تھی میکشی میں

بہار اُسکی، اُسی کا دامن، نسیم اُسکی اُسی کا گلشن
جمال جسکا جھلک رہا ہے چمن چمن میں کلی کلی میں

گلوں سے مستی ابل رہی ہے شراب نکہت اُچھل رہی ہے
ہزاروں نغمے تڑپ رہے ہیں نگاہِ بلبل کی خامشی میں

بکھر نہ جائیں تمام جلوے، چھلک نہ جائے تمام صہبا
ہلاکِ مستی بنا رہے ہیں، مچل مچل کر ہنسی ہنسی میں

حافظ غازیپوری

میں

میں کیا ہوں کیا نہیں ہوں خدا جانتا ہی خوب
صرفِ خلش ہوں یا خلشِ روزگار ہوں

اک نقش آرزو ہوں کہ نقاش آرزو؟
صورت گرِ خیال ہوں فطرت نگار ہوں؟

یا ہوں فریب خوردۂ فردائے زندگی؟
یا خود ہی ایک وعدۂ نا استوار ہوں؟

میں اک نوائے سازِ لبِ خونچکاں ہوں یا؟
ناگفتہ داستانِ شبِ انتظار ہوں؟

یا ہوں زبانِ رازِ شبستانِ خامشی؟
یا نا تمامیٔ نفسِ شعلہ بار ہوں؟

بس مختصر یہ ہے کہ حزینِ خراب ہوں!
غم آشنا دکھے ہوئے دل کی پکار ہوں!

لذت کشِ بلا ہوں مصیبت کشِ فراق
منت کشِ درازیٔ شبہائے تار ہوں،

اک مہرِ بے بسی ہوں بساطِ حیات پر
مجبور ہوں ستم زدۂ روزگار ہوں

فانوسِ کائنات میں تصویرِ آرزو
یعنی فریب خوردۂ لیل و نہار ہوں

حزیںؔ

شاعر کی رات

جب شام کو حسنِ صبح کا عالم ایک فسانہ بنتا ہے
جب چاند کی ضو سے زیرِ سما پُر نور خزانہ بنتا ہے

جب شوخ ستارے ہنستے ہیں اور نور کی بارش ہوتی ہے
جب حسن کی سارے عالم میں آنکھوں سے بہ ستش ہوتی ہے

جب عیش کی موجیں ہستی کو جھولے میں جھلانے آتی ہیں
جب نیند کی پریاں دنیا کو چپکے سے سُلانے آتی ہیں

کچھ نیند سی طاری ہوتی ہے میں کیف میں ڈوبا ہوتا ہوں
معلوم نہیں اس عالم میں میں جاگتا ہوں یا سوتا ہوں

احساس میں کچھ مدہوشی سی محسوس و نمایاں ہوتی ہے
انفاس میں کچھ سرگوشی سی محسوس و نمایاں ہوتی ہے

بجلی سی چمکتی ہوتی ہے، پُر نور نگاہیں ہوتی ہیں
جذبات میں جنبش ہوتی ہے، مسحور نگاہیں ہوتی ہیں

تم میری نظر کے دامن میں انگڑائیاں لیکر سوتے ہو
تم سانس کہیں بھی لیتے ہو، محسوس مجھے تم ہوتے ہو

فطرت واسطی

محسوسات

شوریدہ سری وابستہ ہو اجزائے حیاتِ فانی سے
تزئینِ جمالِ گیتی ہے ہر کیفیتِ انسانی سے
تکمیلِ عمل کی خواہش میں انجام نظر آتا ہی نہیں
احساسِ سکوں کی منزل میں تسکینِ الم پاتا ہی نہیں
برباد سکوں کی ہر خواہش تعجیل کی خواہاں ہوتی ہے
تعجیل نوائی دنیا میں تخریب بداماں ہوتی ہے
امید کا ہر روشن پہلو ظلمات کا حامی ہوتا ہے
اے ولولۂ ابہاز ناکامی کا رنگ دوامی ہوتا ہے!
نیرنگِ ستم، احساسِ الم، اپنی ہی نظر کا دھوکا ہے
ہر لذتِ امکاں "باقی" ہے ہر سانس مسرت افزا ہے
اسبابِ تعیش پیدا ہیں ہر لحظہ حوادث گاہوں سے
انسان اگر بد ذوق نہ ہو دنیائے عمل کی راہوں سے

انسان بھٹک جاتا ہے خود اعمال کی بے پروائی سے
منزل کا نشاں ملتا ہے ورنہ حوصلہ کی پسپائی سے
ذروں کی سبک رفتاری بھی تحریک کی حامل ہوتی ہے
یا محفلِ رقص و جوشِ و الم پر وازِ پہ مائل ہوتی ہے
ایامِ بہارِ رفتہ کی ہلکی سی جھلک تعمیری ہے! ؟
فطرت کے نظارے تخریبی ہیں اور جھلک تعمیری ہے!؟
ہر تابشِ امکاں باقی ہے ہر کاوشِ ہستی فانی ہے
نغموں سے تلاطم پیدا ہے۔ تمہیدِ نظر "حیرانی" ہے!

شمیم نعمانی نیازی

حدیثِ حسن

مصورِ جذبات جناب فطرت واسطی کی پچاس ولولہ انگیز اور سحر اثر نظموں کا مجموعہ ہے جسکی ہر نظم محبت کے لطیف جذبات کی آئینہ دار۔ لطفِ زبان سے رنگین۔ حسنِ تخیل سے مزین۔ ندرتِ بیان میں معجز نما، اور رومانی شاعری کا شاہکار ہے حدیثِ حسن کی تقریباً نصف نظمیں، نگار، شاہکار، زمانہ، اور دوسرے مشاہیر رسالوں میں شائع ہوکر خراج تحسین اور غیر فانی شہرت حاصل کرچکے ہیں۔ اس مجموعہ میں رئیس التحریر حضرت نیاز فتحپوری کی تقریظ کے علاوہ ملک کے دو مایۂ ناز ادیبوں کے فاضلانہ مقدمات شامل ہیں۔ حدیثِ حسن ۱۱۲ صفحات میں۔ دو تصاویر۔ بہترین کتابت۔ کلکتہ کی بنی ہوئی خوشنما جلد اور غیر معمولی آب و تاب کے ساتھ بتیس پونڈ کے چکنے کاغذ پر زیورِ طبع سے آراستہ ہے۔ اور باوجود ان محاسن صوری و معنوی کے قیمت صرف ایک روپیہ (عہ) علاوہ محصول ہے۔ المعلن:۔ منیجر رسالہ شاہکار گورکھپور (یو۔ پی)

اہتمام سرسری اطلاعنامہ بنام دائنان

(دفعہ ۸۴ ایکٹ نمبر ۵ ۔ سنہ ۱۹۲۰ء)

بعدالت جناب مولوی احمد کریم صاحب بار ایٹ لا جج خفیفہ لکھنؤ

درخواست دیوالیہ نمبر ۲۷ سنہ ۱۹۳۵ء

بمقدمہ قرار دئے جانے دیوالیہ مسمیان (۱) موتی ولد دُتی (۲) مسماۃ چھمن زوجہ موتی اقوام مہتر ساکنان گڈھیا چار باغ لکھنؤ

بنام

۱۔ گیا پرشاد } پسران لچھمن داس ساکن رستوگی ٹولہ لکھنؤ
۲۔ بلدیو سہائے }
۳۔ لالہ متھری ساکن رستوگی ٹولہ شہر لکھنؤ
۴۔ گنگا دھر رستوگی ساکن بازار راجہ شہر لکھنؤ
۵۔ بنا ولد متھری ساکن رستوگی ٹولہ شہر لکھنؤ
۶۔ نانک سنگھ قوم سکھ ساکن آریہ نگر لکھنؤ
۷۔ ملک اللہ لبایا ساکن گھسیاری منڈی لکھنؤ
۸۔ آغا شاہ محمد خاں کابلی ساکن امانیگنج لکھنؤ
۹۔ بنواری لال ساکن رستوگی ٹولہ شہر لکھنؤ
۱۰۔ موہن مہراج ولد نامعلوم ساکن چتوا پور بھویاں عقب چوکی پولیس لکھنؤ
۱۱۔ گینیشے ساکن تکیہ پیر جلیل لکھنؤ
۱۲۔ محمود ولد نادر خاں ساکن مولوی گنج لکھنؤ
۱۳۔ آغا حبیب اللہ ولد نامعلوم ساکن ناکہ عیش باغ لال اسکول بنواری جی لکھنؤ
۱۴۔ گومل داس رستوگی ساکن رستوگی ٹولہ لکھنؤ
۱۵۔ درگا ولد نامعلوم ساکن ناکہ ہنڈولا شہر لکھنؤ۔

اطلاع دی جاتی ہے کہ بتاریخ ۲۵ ماہ مئی سنہ ۱۹۳۵ء مدیون مذکور الصدر نے ایک قطعہ درخواست اس عدالت میں بدیں غرض پیش کی ہے کہ وہ دیوالیہ قرار دیا جاوے اور یہ کہ بتاریخ ۳۰ ماہ مئی سنہ ۱۹۳۵ء عدالت ہذا نے اس امر کا اطمینان کرکے کہ مدیون کی جائداد مبلغ پانچ سو روپیہ سے زائد نہ ہوگی ہدایت کی ہے کہ مدیون کی جائداد کا اہتمام سرسری طریقہ پر کیا جاوے اور تاریخ بست و سوم ماہ اگست ۱۹۳۵ء بنا بر مزید سماعت درخواست و اظہار مدیون مذکور مقرر کی ہے۔ اس امر کی بھی اطلاع دی جاتی ہے کہ عدالت تاریخ مذکور الصدر پر تصفیہ و تقسیم جائداد مدیون مذکور کی فوراً کارروائی شروع کر سکتی ہے۔ تم کو اختیار ہے کہ تم حاضر ہو کر اس تاریخ پر ثبوت دو۔ ثبوت کسی دعوے کا جو تم کرنا چاہو تاریخ مذکور پر یا اس کے قبل داخل عدالت کرنا لازمی ہوگا۔

میرے دستخط اور مہر عدالت سے آج بتاریخ ۱۷ ماہ اگست ۱۹۳۵ء جاری کیا گیا۔

بحکم عدالت
بشمبر دیال منصرم
عدالت جج خفیفہ لکھنؤ

وقت حاضری عدالت دس بجے سے چار بجے تک